جمادی الاولیٰ/جمادی الثانیہ
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
جنوری 2022

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

2022

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراچی ۷۴۸۰۰ - پاکستان

Ref. No. _____

Date. _____

باسمہ تعالیٰ

از: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم
محترم اساتذہ کرام، ائمہ مساجد، ذمہ داران مدارس ومکاتب اور پرنسپل حضرات

طلبہ وطالبات کی تربیت کے لیے چند گزارشات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت ہمارا اسلامی وقومی فریضہ ہے۔ بچے ملک وقوم کے معمار اور معاشرے کا حسن ہوتے ہیں۔

اگر انھیں صحیح تعلیم وتربیت دی جائے تو اس سے ایک مضبوط اور مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ کیوں کہ انھی بچوں میں سے پڑھ لکھ کر کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی انجینئر، کوئی عالم دین، کوئی افسر، کوئی تاجر، کوئی قانون دان، کوئی سیاست دان تو کوئی صحافی، الغرض زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہوکر وہ ملک وقوم کی خدمت میں حصہ لیتے ہیں۔

بچوں کی تعلیمی وتربیتی ترقی کے لیے آپ ۴ کام پابندی سے فرمائیں تو ایک کام یاب معاشرے کے وجود میں آپ کا ضرور حصہ ہوگا:

۱۔ آپ بچوں کے لیے خوب دعائیں مانگیں، ان پر خوب محنت کریں، ان کے بول چال پر نظر رکھیں۔ سچائی، امانت داری، ایثار، والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، پڑوسیوں کا خیال، چھوٹوں پر شفقت اور ہر کام کو محنت ولگن سے صحیح طریقے سے کرنے کا بار بار درس دیں۔ یہ صفات بچوں کی زندگی میں آجائیں اس کے لیے "تربیتی نصاب" کے نام سے ایک نصاب تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ اور بزرگان دین کے حالات اور واقعات کو مختلف مثالوں اور کہانیوں کے ذریعے ان کے سامنے بیان کریں۔ ساتھ ہی عملی پہلوؤں کی الگ سے نشان دہی بھی کریں۔ اس کے علاوہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات" اور "تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات" نامی کتابوں سے بچوں کو پڑھ کر سنائیں اور ان کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔

۳۔ بچوں کو اردو زبان میں اچھے مواد پر مشتمل دینی رسائل وجرائد کے پڑھنے اور ان میں لکھنے کا عادی بنائیں۔ جس سے انھیں زبان وبیان کے ساتھ عمدہ تحریر پر قدرت حاصل ہوگی۔ پھر جب وہ عملی میدان میں جائیں گے تو آنے والی نسلوں کے سامنے اپنی بات اچھے انداز میں پیش کرسکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

الحمد للہ! اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے "جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن" "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے فضلاء اور "اسکولوں کے اساتذہ کرام" کی زیر نگرانی بچوں کا ماہ نامہ "ذوق وشوق" شائع ہورہا ہے۔ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ جس میں بچوں کو اساتذہ کرام اور والدین کے ادب، اسکول ومدرسے کی پابندی، پان گٹکا اور بری صحبت سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھتے ہوئے شکر بھی ادا کرتا ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

۴۔ اسکولوں میں بچوں کی تربیت کے لیے "پانچ منٹ کا مدرسہ" ایک کتاب تیار کی جارہی ہے۔ اگر اسمبلی میں روزانہ ۵ منٹ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنا دی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ ائمہ مساجد اور بنات کے مدارس کے مہتممین سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو طالبات اور مقتدیوں کو بعد فجر یا عصر مناسب ہو تو سنائیں۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ خود بھی اس کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر، خاندان، اسکول، مکاتب اور مدارس کے بچوں کو اس کے پڑھنے کی خوب ترغیب دیں۔ تاکہ ہماری نسل کتاب دوست بنے۔ مساجد سے ملحق چھوٹی سی لائبریری بنائیں، نوجوانوں کو مطالعے کا شوق دلوائیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری اس گزارش پر عمل کرکے معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ضرور ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی قدم قدم پر مدد فرمائے اور آپ حضرات کو ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھے۔ آمین

والسلام

عبدالرزاق اسکندر

۱۴۴۰/۱/۲

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبداللہ بن مسعود

(مفہوم آیت، سورۂ ق:۱۸)

انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اُس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے، ہر وقت لکھنے کے لیے تیار۔

عزیز ساتھیو! اس مبارک ارشاد میں ہمیں ایک بہت ہی اہم بات کی طرف متوجہ فرمایا جارہا ہے۔

ہم صبح اٹھنے سے رات سونے تک کتنی باتیں کرتے ہیں، ہمارے منہ سے کتنے جملے نکلتے ہیں! اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعے ہمیں خبردار کررہے ہیں کہ یہ ساری باتیں اور جملے لکھے جارہے ہیں۔ ہمارے الفاظ پر ایک نگران مقرر ہے جو ہر وقت لکھنے کے لیے تیار ہے۔ خیر کی بات ہو یا شر کی، ثواب کا جملہ ہو یا عتاب کا، دل شکنی کا جملہ ہو یا راحت رسانی کا، ہر چیز ریکارڈ اور محفوظ ہورہی ہے اور آخرت میں یہ ساری چیزیں انسان کے سامنے لائی جائیں گی اور اِن کا بدلہ دیا جائے گا۔

ہماری بات کتنی اہمیت کی حال ہے؟ اس بارے میں ہم آپ کو پیارے نبی ﷺ کے ایک مبارک ارشاد کا مفہوم بتاتے ہیں:

''بندہ کوئی لفظ منہ سے نکالتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی خوش نودی ہوتی ہے اور وہ اسے معمولی سمجھ رہا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے درجات بلند فرمادیتے ہیں۔ اسی طرح بندہ کوئی ایسا جملہ منہ سے نکالتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہوتی ہے، اس کے نزدیک اس جملے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، لیکن یہ بظاہر معمولی سا جملہ اس کے جہنم میں گرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔'' (الصحیح للبخاری، الرقم:6113)

معلوم ہوا کہ ہماری معمولی سی بات جہاں ہمارے جنت میں جانے کا باعث بن سکتی ہے وہیں ہمیں جہنم کا مستحق بھی بنا سکتی ہے۔

اس لیے اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ میری باتوں سے کسی کا دل تو نہیں دکھتا، میرے منہ سے کسی کی برائی تو نہیں نکلتی، میں کسی کو طعنہ تو نہیں دیتا، کسی کو بُرا بھلا تو نہیں کہتا! خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو فوراً اِستغفار کرلیں، اُس ساتھی سے بھی معافی مانگ لیں اور آئندہ کے لیے عزم کرلیں کہ ایسے جملوں سے اپنے زبان کی حفاظت کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اچھی بات کرنے کی اور بُری باتوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پیغامِ نبوی ﷺ

اِرشد علی نواب شافی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

''مہمان کے بُرا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ پیش کردہ کھانے کو کم تر سمجھے۔''

(مجمع الزوائد، البر و الصلة، باب فی من احتقر مال قدم الیه، الرقم: ۱۳۶۳)

عزیز ساتھیو! ہم لوگ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں، کیوں کہ انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔

ہم کبھی رشتے داروں سے ملنے کے لیے جاتے ہیں اور کبھی وہ لوگ ہماری محبت کی خاطر ہمارے پاس آتے ہیں۔ اسی طرح دوست احباب آتے ہیں۔ ہماری سینکڑوں لوگوں سے رشتے داریاں ہیں۔ ان کے حقوق ہیں۔

لہٰذا جب ہمارے پاس کوئی آئے تو ہمیں میزبانی کیسے کرنی چاہیے؟ اور جب ہم کسی کے ہاں مہمان بن کر جائیں تو پھر ہمارا برتاؤ اور رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

ایک مرتبہ آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو اُنھوں نے کھانے میں روٹی، اور سالن کے طور پر سرکہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا:

''سرکہ! کیا ہی بہترین سالن ہے!''

(سنن ابن ماجه، الرقم: ۳۳۱۸)

یعنی آپ ﷺ نے روز اِستعمال ہونے والی معمولی چیز کو بھی بہترین سالن فرمایا اور اہلِ خانہ کو شرمندگی سے بچایا۔

عزیز ساتھیو! اس لیے جب کبھی کسی کے ہاں مہمان بن کر جائیں تو میزبان جو پیش کرے خوشی سے اسے قبول کریں اور تعریف کے کلمات ضرور کہیں کہ ماشاء اللہ! کھانا بہت مزے دار تھا۔ مزہ آگیا!

اور میزبان نے جو کچھ پیش کیا ہے اسے کبھی حقیر نہ سمجھیں۔ ہوسکتا ہے ان کی اتنی ہی گنجائش ہو یا اس وقت ان کے لیے اس کے علاوہ کچھ اور پیش کرنا مشکل ہو۔

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیر سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

جمادی الاولیٰ/جمادی الثانیہ ۱۴۴۳ ہجری | جلد: 17

شمارہ: 01

ناشر: محمد عارف رشید

مجلس ادارت

- مدیر: عبدالعزیز
- معاون: محمد طلحہ شاہین

سرورق السٹریٹر: سید ناصر

آرٹسٹ: قیصر شریف

کمپوزر: سعد علی

نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 80

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1100/=

بذریعہ عام ڈاک 850/=

ماہ نامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہ نامہ ذوق و شوق بی۔او۔ بکس # 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

ذوق شوق/zouq shouq

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0324-2028753 , 0320-1292426

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00

دوپہر 2:30 تا 6:00

سالانہ خریداری بذریعہ میزان بینک اکاؤنٹ:

اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm trust zouq o shouq

اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456، سولجر بازار برانچ، کراچی

(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید اس نمبر (0324-2028753) پر واٹس ایپ کردیں۔)

سیرت کہانی	عبدالعزیز 04
بلاعنوان (۱۷۳)	قرۃ العین خرم ہاشمی 06
خندق کنارے	دانیال حسن چغتائی 08
شور با کھیر	عمارہ فہیم 11
محنت کا صلہ	شیراز نثار 13
مہمان اور میزبان (نظم)	انصار احمد معروفی قاسمی 16
کھڑکھاند گروپ مچھلی کے شکار پر	فتح محمد عرشی 17
سوال آدھا، جواب آدھا (کھیل)	الطاف حسین 20
تقدیر نہیں بدلتی	مریم شہزاد 21
چار چاند	ڈاکٹر الماس روحی 23
جھوٹوں کے جھوٹے	حافظ محمد دانش عارفین حیرت 24
جذبۂ ایثار	روبینہ عبدالقدیر 26
ذوق معلومات	الطاف حسین 28
ہماری حجامت	ادیب سمیع چمن مرحوم 29
اندھیروں کا لشکر (تاریخی جھانکیاں)	محمد حذیفہ رفیق 32
اپنا گھر	اکمل معروف 34
فسطاط	انتخاب: عبدالعزیز 37
فاتح کون	نذیر انبالوی 38
ننھے میاں کی سائیکل	سیف الرحمٰن سیفی 42
اللہ لوک	قانتہ رابعہ 48
اور یہ ہے اپنا بہاول پور	الطاف حسین 50

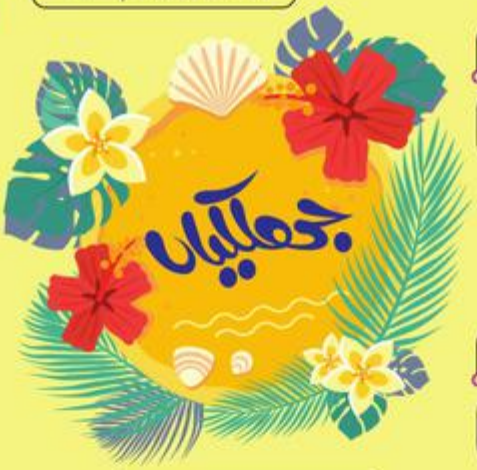

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیمی و تربیتی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE , LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

''ٹرن ٹرن، ٹرن ٹرن!''

ہم گھر پہنچے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہم نیچے جانے سے پہلے حسبِ دستور کھڑکی سے جھانکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے دو قابلِ احترام پڑوسی ہمیں نیچے آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

''خیر تو ہے؟'' ہم نے ادب سے سبب پوچھا۔

''جی، وہ آپ کی دیوار پر پتنگ کی ڈور سے ایک کبوتر لٹک رہا ہے! ذرا نیچے آ کر نظارہ کر لیں اور پھر اُسے آزاد کرنے کی تدبیر کریں۔''

''ایک منٹ رُکیے۔'' یہ کہہ کر ہم نے کمرے کی دوسری کھڑکی کھولی اور اپنی مُنڈی نکال کر جو اپنے دائیں طرف اوپر کو دیکھا تو واقعی ایک پیارا سا جنگلی کبوتر ڈور میں جھول رہا تھا۔ غالباً اس کے دونوں پروں سے مانجھا لپٹ گیا تھا اور مانجھے کا دوسرا سرا ہماری چھت پر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

ہم جلدی سے چھت کی طرف دوڑے۔ کرسی رکھ کر دیوار پر سے گزرتی ڈور کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنا شروع کیا۔ کبوتر صاحب خاموشی سے ہماری گرفت میں آ گئے۔ ہم نے انھیں ڈور سے آزاد کروا دیا۔ یوں تھوڑی دیر لگی اور ہمارے ہاتھوں سے کبوتر صاحب اڑ گئے۔

آپ نے ''ہاتھوں کے طوطے اُڑنا'' تو سنا ہوگا، آج ''ہاتھوں کا کبوتر اڑنا'' بھی پڑھ لیا۔

کبوتر اُڑ کر سامنے کے مکان کی کھڑکی کے چھجے پر اپنے دوستوں سے جا ملے۔

''کبوتر اُڑ گیا! کبوتر بچ گیا!''

یہ سارا نظارہ ہمارے قابلِ احترام پڑوسیوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھوٹی بچی بھی دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ نعرہ اسی نے لگایا تھا۔

''کبوتر کا میں نے ہی اپنے ابو کو بتایا تھا!'' اس نے اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت خوشی سے کہا۔

ہمارے دیگر پڑوسی بھی ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چل دیے اور ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ وہ واقعہ آپ اندر کے صفحات میں پڑھ سکیں گے۔ اس واقعے سے ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ سوچنا آپ کے ذمے رہا!

سیرت کہانی ۳۲

عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

انصار کے لوگ،

چاہے مرد ہوں یا عورتیں،

آپ ﷺ کی خدمت میں تحفے پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو یہ دیکھ کر حسرت ہوتی، چناں چہ انھوں نے اپنے دس سالہ بیٹے انس کو حضور ﷺ کی خدمت کرنے کے لیے یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ

"یا رسول اللہ! یہ آپ کا ننھا منا خادم ہے، اسے قبول فرمائیے اور اس کے لیے دعا فرمائیے۔"

حضور ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:

"اے اللہ! اس کے مال و اولاد اور عمر میں برکت عطا فرما۔"

آپ ﷺ کی بابرکت دعا کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے لوگوں کے کھجور کے باغ سال میں ایک مرتبہ پھل دیتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کھجور کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا۔ اسی طرح ان کی اولاد میں اتنی برکت ہوئی کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے ایک سو بیس افراد دیکھے۔ عمر میں ایسی برکت ہوئی کہ سن ۹۳ ہجری تک زندہ رہے اور ایک سو تین برس کی عمر میں وفات پائی۔

صرمہ بن ابی انس انصاری رضی اللہ عنہ بھی سن ایک ہجری میں ایمان لائے۔ یہ ابتدا ہی سے توحید کے قائل تھے اور کفر و شرک سے نفرت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ عیسائی مذہب میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، لیکن پھر ملتوی کر دیا۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ الگ تھلگ رہتے تھے۔ کبھی باریک کپڑا نہ پہنتے تھے، موٹے کپڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ عبادت کے لیے خاص کوٹھڑی بنا رکھی تھی، جس میں ناپاک لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی اور یہ کہتے تھے کہ میں ابراہیم کے رب کی عبادت کرتا ہوں۔ اپنے زمانے کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن ان کے اشعار میں فضول باتیں نہ ہوتی تھیں، بل کہ ان کے اشعار نصیحت سے بھرے ہوتے تھے۔

جب تک آں حضرت ﷺ مکہ مکرمہ میں رہے، اس وقت تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، مگر اس طرح کہ بیت اللہ بھی سامنے رہے۔ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت نہ ہو سکی کہ ایک ساتھ دونوں قبلوں کی طرف رخ کر سکیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر آپ ﷺ کے دل میں بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کی وجہ سے آپ ﷺ بار بار آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے کہ کب بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوگا۔ چناں چہ نصف شعبان، سن دو ہجری میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا، جس کا مفہوم ہے:

"پس آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔"

(سورہ بقرہ، آیت: ۱۴۹)

ہوا یہ تھا کہ آپ ﷺ قبیلہ بنی سلمہ میں حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت اُم بشیر بن براء رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے لیے کھانا تیار کر لیا۔ وہاں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تو آپ ﷺ نے مسجد بنی سلمہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ظہر کی نماز اَدا فرمائی۔ جب آپ ﷺ دو رکعت ادا فرما چکے تب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا اشارہ فرمایا۔

آپ ﷺ نے نماز ہی میں گھوم کر بیت اللہ کی طرف رخ کرلیا۔ آپ کے ساتھ مقتدی بھی گھوم گئے۔ تب سے اس مسجد کا نام ''مسجد قبلتین''، یعنی دو قبلوں والی مسجد مشہور ہوگیا اور یہ مسجد آج تک اسی نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ مسجد مدینہ منورہ کے شمال کی جانب ایک پہاڑی سلسلے پر واقع ہے۔ (فرہنگ سیرت، ص: ۳۵۴، مرتب: سید فضل الرحمن، ناشر: زوار اکیڈمی، کراچی)

اس مسجد میں دو محرابیں ہیں: ایک بیت المقدس کی جانب، دوسری کعبہ شریف کی جانب۔

قبلہ تبدیل ہونے کے بعد مسجد نبوی ﷺ کا رُخ بیت اللہ کی طرف ہوگیا تو قبلہ اول کی طرف کی دیوار اور اُس کے ساتھ جو جگہ تھی وہ ان غریب فقیر مسلمانوں کے ٹھہرنے کے لیے ویسے ہی چھوڑ دی گئی، جن کا کوئی ٹھکانا اور گھر بار نہ تھا۔

یہ جگہ صفہ کے نام سے مشہور تھی۔ ''صفہ'' اصل میں سایہ دار جگہ کو کہتے ہیں۔ جو لوگ صفہ میں حضور ﷺ سے قرآن و حدیث کا علم سیکھنے کے لیے یہیں ٹھہرے رہتے ان حضرات کو ''اصحاب صفہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اصحاب صفہ دن رات یہیں رہتے تھے۔ انھیں تجارت و زراعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس بدن کا اوپری حصہ ڈھانپنے کے لیے چادر تک نہ تھی۔ صرف لنگی یا کمبل ہوتا تھا جسے اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے اور وہ بھی اس قدر چھوٹا ہوتا تھا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک اور وہ ہاتھ سے اسے تھامے رہتے کہ کہیں ستر نہ کھل جائے۔''

(الصحیح للبخاری، باب نوم الرجال فی المسجد، ج: ۱، ص: ۶۳)

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ کہا کرتے تھے:

''قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں بعض اوقات بھوک کی وجہ سے اپنا پیٹ اور سینہ زمین پر لگا دیتا، تاکہ زمین کی نمی اور ٹھنڈک سے بھوک میں کچھ کمی آجائے اور بعض اوقات پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا، تاکہ سیدھا کھڑا ہوسکوں۔

ایک روز میں راستے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابوبکر وہاں سے گزرے۔ میں نے ان سے کوئی بات پوچھی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ابوبکر میری حالت کو دیکھ کر کھانا کھلانے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے جائیں، لیکن ابوبکر چلے گئے اور میرا مقصد نہ سمجھے۔

اسی طرح عمر وہاں سے گزرے۔ ان سے بھی میں نے اسی طرح کچھ پوچھا، مگر وہ بھی گزر رے چلے گئے۔

کچھ دیر بعد حضور وہاں سے گزرے، مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے، مسکرائے اور فرمایا:

'اے ابو ہریرہ!'

میں نے عرض کیا:

'یارسول اللہ! حاضر ہوں۔'

آپ ﷺ نے فرمایا:

'میرے ساتھ چلو۔'

میں آپ ﷺ کے ساتھ ہولیا۔ آپ ﷺ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پیالہ دودھ کا رکھا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے گھر والوں سے دریافت فرمایا:

'یہ دودھ کہاں سے آیا؟'

انھوں نے بتلایا کہ فلاں آدمی نے آپ کو یہ تحفہ بھیجا ہے۔

آپ نے فرمایا:

'ابو ہریرہ! اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔'

اس وقت یہ حکم مجھے بہت بھاری لگا اور میں نے اپنے دل میں کہا:

یہ ایک پیالہ دودھ، اصحاب صفہ کے لیے کہاں کافی ہوگا! اس دودھ کا تو میں حق دار تھا کہ اسے پی کر کچھ طاقت حاصل کرتا۔ جب اصحاب صفہ آجائیں گے تو آپ ﷺ مجھے ہی سب کو پلانے کا حکم دیں گے اور لگتا نہیں ہے کہ سب کو پلانے کے بعد میرے لیے اس میں سے کچھ بچے گا، لیکن اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی بات مانے بغیر چارہ نہیں تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر 10 پر

''فاطمہ! آپ کی یوم پاکستان پر لکھی تقریر بہت عمدہ ہے۔''

مس میمونہ نے مسکرا کر کہا تو آٹھویں کلاس کی سب طالبات گردن گھما کر پچھلی بنچ پر بیٹھی فاطمہ کو دیکھنے لگیں، جس کے چہرے پر تعریف سن کر روشنی پھیل گئی تھی۔ فاطمہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ لیے کھڑی ہوگئی۔

''مس! یہ تقریر مجھے دادا جان نے لکھ کر دی ہے۔''

فاطمہ نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا تو دُور بیٹھی مس کو اُس کی پوری بات سمجھ نہیں آئی۔ انھوں نے سوالیہ نگاہوں سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

''مس! فاطمہ کہہ رہی ہے کہ یہ تقریر اُس کے دادا جان نے لکھی ہے۔'' کلاس مانیٹر عظمیٰ نے کہا تو مس میمونہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''آپ بہت تیز بولتی ہیں۔ اکثر مجھے آپ کی بات سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔'' مس میمونہ نے سرسری انداز میں کہا۔

''مس! فاطمہ چاہے کتنی بھی اچھی تقریر لکھوالے، کبھی بھی مقابلہ جیت نہیں پاتی، کیوں کہ فاطمہ اتنا تیز بولتی ہے کہ اس کی آدھی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔''

عظمیٰ نے کہا تو فاطمہ کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوگیا۔

''تقریری مقابلے میں حصہ لینے والی سب بچیاں تیاری کر کے آئیں۔ تقریری مقابلے کے لیے تین لڑکیوں کا انتخاب کل ہوگا۔''

مس میمونہ نے عظمیٰ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ہدایت کی تو سب نے جلدی سے گردن ہلا دی۔ فاطمہ گھر واپس آئی تو بہت پریشان تھی۔ اس کی پریشانی دادا جان کی نگاہوں سے چھپی نہ رہی۔

''امی! کل مجھے صبح جلدی اسکول.....''

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر فاطمہ نے اپنی ماں روبینہ کو مخاطب کیا، جو میز سے برتن اٹھانے میں مصروف تھیں۔

''فاطمہ! میں ابھی فارغ نہیں ہوں۔ بہت سارے کام کرنے ہیں۔ تم چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھ لینا، کہیں گھر سے باہر نہ نکل جائیں۔''

روبینہ، فاطمہ کی بات کاٹ کر جلدی سے کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل گئی تو فاطمہ نے جھنجھلا کر خاموش بیٹھے دادا جان کی طرف دیکھا۔

''فاطمہ بیٹی! پریشان کیوں ہو؟ کیا تقریر منتخب نہیں ہوئی؟'' دادا جان نے نرمی سے سوال کیا۔

''دادا جان! مس میمونہ کو تقریر تو بہت پسند آئی ہے، مگر.....'' فاطمہ نے سر جھکا لیا۔

''مگر کیا!؟'' دادا جان نے حیرانی سے اس کے مایوس چہرے کی طرف دیکھا۔

''دادا جان! میں تیز تیز بولتی ہوں، کسی کو میری بات پوری سمجھ نہیں آتی۔ تقریر کیسے کروں گی؟'' فاطمہ نے پریشانی سے کہا۔

''فاطمہ بیٹی! آپ آرام آرام سے بولنے کی کوشش کیا کرو۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ بہت نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کا ہر ہر لفظ الگ الگ اور واضح ہوتا تھا۔ جو بھی اسے سنتا، سمجھ لیتا۔''

(سنن ابوداود، ۴۸۳۹)

دادا جان نے ہمیشہ کی طرح سنت نبی ﷺ کی روشنی میں راہ دکھائی تو فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

فاطمہ سارا دِن ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہوئے تقریر کرنے کی مشق کرتی رہی۔ اس نے دادا جان کو بھی تقریر سنائی۔ دادا جان نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی اور اُس کی خامیاں بھی بتائیں۔

اگلے دن فاطمہ اسکول گئی تو بہت پُرجوش تھی، مگر جب مس میمونہ نے ڈائس پر آ کر پوری کلاس کے سامنے تقریر کرنے کا کہا تو فاطمہ کا سارا اِعتماد کہیں گم ہوگیا اور وہ دادا جان کی سب ہدایات کو بھلا کر، پہلے کی طرح تیز رفتاری سے بولنے لگی۔ اس کی بہترین تقریر، تیز لہجے اور سمجھ میں نہ آنے والے لفظوں کی وجہ سے منتخب ہونے سے رہ گئی۔

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 جنوری 2022 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

فاطمہ نے نم آنکھوں سے مقابلے کے لیے منتخب تین لڑکیوں کی طرف دیکھا، جن کی لکھی تقریر اِتنی اچھی نہیں تھی، مگر اُن کے خوب صورت اندازِ بیان نے عام سی تقریر کو بھی دل کش بنا دیا تھا۔ فاطمہ گھر واپس آئی تو دادا جان کے پوچھنے پر بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''دادا جان! میں نے تقریر.....'' فاطمہ نے روتے ہوئے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ پاس بیٹھی روبینہ نے ہمیشہ کی طرح بیٹی کو ٹوک دیا:

''فاطمہ! تمھاری عادت ہے چھوٹی چھوٹی بات پر آنسو بہانے کی۔ تقریری مقابلے اتنے ضروری نہیں ہوتے۔ پڑھائی پر توجہ دیا کرو۔''

روبینہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''مگر اَمی! میں پڑھتی بھی ہوں اور مجھے تقریر کرنے کا شوق.....'' فاطمہ نے جلدی سے کہا کہ کہیں اس کی والدہ دوبارہ بات نہ کاٹ دیں۔

''اگر تقریر کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اپنا اندازِ گفتگو بہتر بناؤ۔ اتنا تیز تیز بولتی ہو کہ آدھے لفظ ادا ہی نہیں کرتیں۔ آدھی بات سمجھ میں آتی ہے اور آدھی نہیں۔ بھلا تمھیں جلدی کس بات کی ہوتی ہے۔'' روبینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

روبینہ کے خاموش ہوتے ہی دادا جان نے فاطمہ کو باورچی خانے سے پانی لانے کا کہا۔ فاطمہ دادا جان کی بات سُن کر پانی لینے نیچے چلی گئی۔

''آج مجھے اندازہ ہوا کہ فاطمہ کے تیز بولنے کے پیچھے اصل وجہ کیا ہے؟'' فاطمہ کے جانے کے دادا جان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ابا جی! وجہ آج کل کی نسل کی جلد بازی ہے اور کیا ہے!؟'' روبینہ نے جلدی سے کہا تو دادا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

''فاطمہ کے تیز بولنے کی وجہ، روبینہ بیٹی! آپ کا بات بات پر اُسے ٹوکنا ہے۔ شاید آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ فاطمہ کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ فاطمہ اتنا تیز اِس لیے بولتی ہے کہ اسے ڈر ہوتا ہے کہ آپ پوری بات سنے بغیر اُس کی بات کاٹ دیں گی۔ روزمرہ کی یہ معمولی سی عادت اب اس کی شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔''

دادا جان نے نرمی سے سمجھایا تو روبینہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا:

''ابو! میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گی۔''

اتنی دیر میں فاطمہ پانی لے آئی۔ دادا جان نے فاطمہ سے پوچھا:

''بیٹا! آپ سوچ کر یہ بتائیں کہ تیز بولنے کی کوئی خاص وجہ جو آپ کے ذہن میں ہو؟''

''دادا جان! مجھے بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ امی میری بات پوری نہیں سنیں گی، اس لیے میں جلدی جلدی بولنے کی کوشش کرتی ہوں، مگر دادا جان! میں سچ کہوں تو میرا دِل بھی چاہتا ہے کہ میں آرام سے بات کروں، تاکہ میری بات سننے والوں کو آسانی سے سمجھ میں آ سکے۔''

فاطمہ نے بے بسی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اور کلاس میں بھی سب لڑکیاں میرے تیز بولنے کی وجہ سے میرا مذاق اُڑاتی ہیں۔ اسی وجہ سے میرا اسکول جانے کا دل نہیں کرتا اور نہ ہی پڑھنے کا۔''

فاطمہ نے بے زاری سے جلدی جلدی کہا تو دادا جان نے روبینہ کی طرف دیکھا جو ساری صورتِ حال کا اندازہ کر کے پریشان ہو گئی تھی۔

''فاطمہ! میں آئندہ خیال رکھوں گی کہ تمھاری بات ختم ہونے کا انتظار کروں۔ تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ پوری کوشش کرو گی کہ ٹھہر ٹھہر کر خوب صورت لہجے میں بات کرو۔''

روبینہ نے مسکرا کر کہا تو فاطمہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی امی! پکا والا وعدہ، مگر آپ مجھے.....''

فاطمہ تیز بولتے بولتے یک دم رک گئی، کیوں کہ روبینہ اور دادا جان اس کے دوبارہ تیز بولنے پر اُسے گھور رہے تھے۔

''اوہ، معذرت!''

فاطمہ نے گھبرا کر جلدی سے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھے تو دادا جان کے ساتھ ساتھ روبینہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

خندق کنارے

دانیال حسن چغتائی۔ کہروڑ پکا

کافروں کا لشکر دس ہزار سے زائد افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سینکڑوں گھڑ سوار اور اُونٹ سوار شامل تھے۔ عرب کے لوگوں نے آج تک اتنا بڑا لشکر نہیں دیکھا تھا۔ یہ لشکر مدینے پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔

اس لشکر کی سرداری ابوسفیان کے سپرد تھی۔ ہر کافر یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ مٹھی بھر مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور آج ہم اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

کئی کافر یہ سوچ رہے تھے کہ مسلمان ایک عظیم الشان لشکر دیکھ کر مدینے سے بھاگ جائیں گے۔ دیکھا جائے تو یہ مقابلہ بھی نہ بنتا تھا۔ ادھر دس ہزار کا ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس لشکر اور اُدھر تین ہزار مسلمان اور اُن میں سے بھی زیادہ تر مناسب ہتھیاروں سے محروم!

لیکن مسلمانوں کے پاس ایمان کی طاقت تھی۔ وہ اللہ سے ڈرتے تھے، اور اللہ سے ڈرنے والے کبھی بھی کسی سے نہیں ڈرتے۔

اس موقع پر ایک صحابی سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ خندق کھودی جائے، تاکہ دشمن مدینے میں داخل نہ ہو سکے۔

پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کو یہ مشورہ پسند آیا، چناں چہ خندق کھودی جانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ بھی سب کے ساتھ مل کر خندق کھود رہے تھے۔

کدالوں اور بیلچوں نے زمین کا سینہ چیرنا شروع کر دیا تھا۔ کھدائی کے دوران میں ایک سخت چٹان آئی کہ ٹوٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور اللہ کا نام لے کر کدال سے ایسی ضرب لگائی کہ چٹان ریزہ ریزہ ہو گئی۔

ادھر کھدائی کا کام بڑی تیزی سے جاری تھا اور اُدھر کفار کا لشکر مدینے کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔

لشکر کفار، مدینے کے پاس پہنچ گیا، مگر یہ کیا!؟ لشکر آگے بڑھنے سے رک گیا تھا۔ لشکر کا سردار ابوسفیان جو پیچھے تھا، گھوڑا دوڑاتا آگے آنے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ رک کیوں گئے ہو؟ اے بہادرو! آگے بڑھو اور مسلمانوں کا صفایا کر دو۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے آ گیا اور پھر اُسے بھی رکنا پڑا۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ لشکر کے آگے نہ بڑھنے کی وجہ اسے نظر آ گئی تھی۔ اس کے سامنے خندق تھی، گہری اور چوڑی خندق! جسے پھلانگنا گھوڑوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

''لات و منات کی قسم! میں نے اس سے پہلے یہ چیز نہیں دیکھی۔'' ابوسفیان بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سردار! اس سرزمین پر کسی نے بھی اس سے پہلے خندق نہیں کھودی۔'' ایک اور سردار نے کہا۔

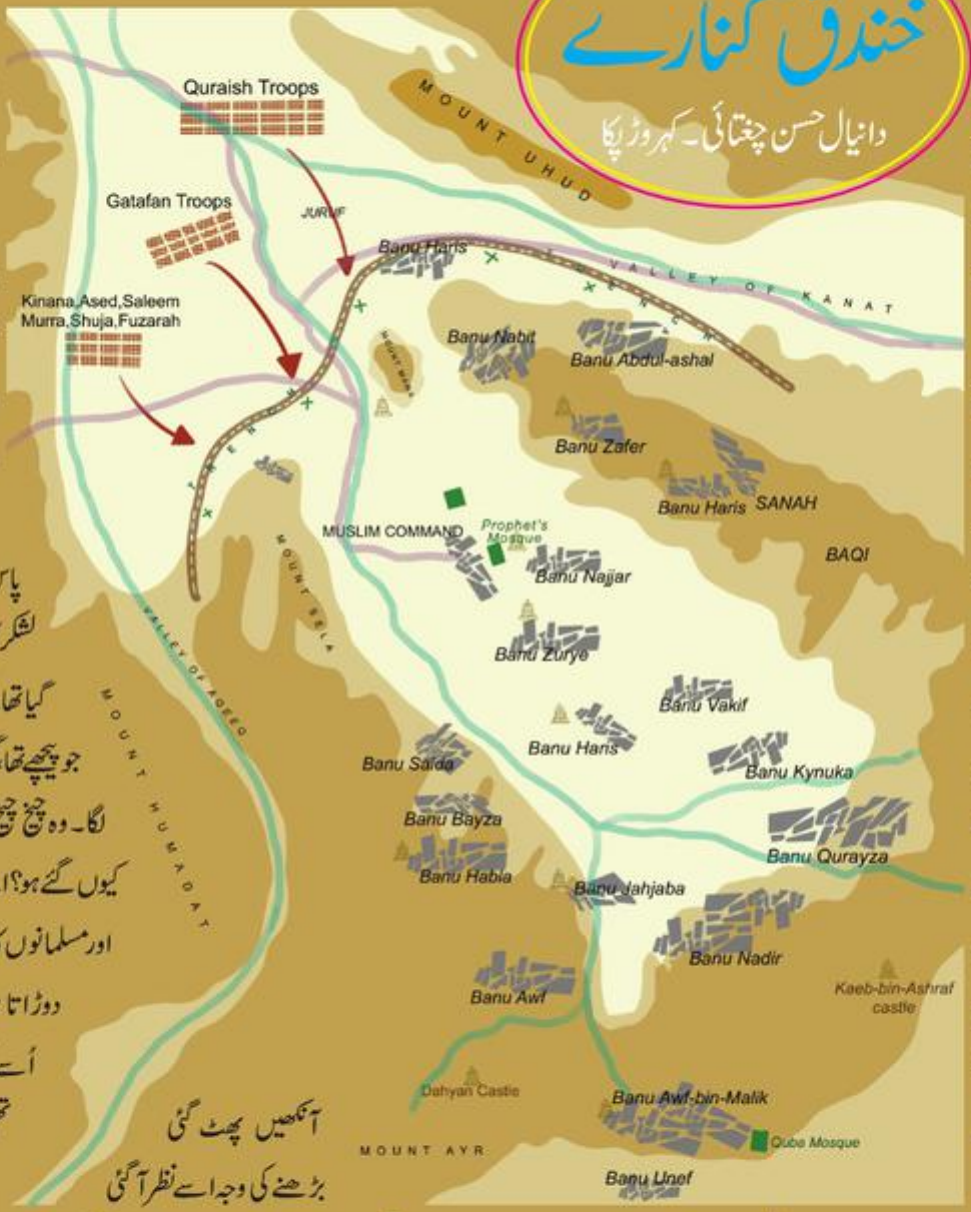

''اب کیا کیا جائے؟''

یہ وہ سوال تھا جو تقریباً ہر کافر کے ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ وہ تو ایک ہی ہلّے میں مسلمانوں کو کچل دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے اور یہاں لمبی چوڑی خندق ان کا منہ چڑا رہی تھی کہ ہمت ہے تو آؤ، مجھے پھلانگو اور مسلمانوں سے مقابلہ کرو۔

آخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ مدینے کا محاصرہ کرلیا جائے۔ مسلمان خود ہی بھوک سے تنگ آکر مقابلے پر آجائیں گے، چناں چہ مدینے کا محاصرہ کرلیا گیا۔

یہ محاصرہ بائیس دن تک جاری رہا۔ مدینے میں خوراک کا ذخیرہ کم تھا، مگر مسلمانوں کے پاس جذبۂ ایمانی کی کمی نہ تھی، انھیں اللہ پر بھروسا تھا۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھوکے پیاسے اللہ کی راہ میں جان دینے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے پیٹ مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

کافروں کے لشکر کا بُرا حال تھا۔ وہ تو مسلمانوں کو جھٹ پٹ تباہ و برباد کردینے اور شہر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کا ارادہ لے کر آئے تھے، مگر کرنا پڑ گیا تھا محاصرہ، ان کے پاس بھی خوراک اتنی زیادہ نہ تھی کہ آرام سے بیٹھے رہتے۔ کافروں کے سردار ابوسفیان نے پریشان ہوکر اپنے کمانڈروں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ محاصرہ ختم کرکے واپس جانے میں بڑی ذلت تھی۔

ایک کمانڈر نے کہا:

''میں نے خندق کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا ہے، ایک جگہ سے خندق ذرا تنگ ہے اور زیادہ گہری بھی نہیں ہے۔ وہاں سے ہمارے گھڑسوار خندق پار کرسکتے ہیں۔''

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے اکڑ کر کہا:

''تو پہلے میں اور میرے ساتھی خندق پھلانگ کر مسلمانوں کو للکاریں گے۔''

وہ جگہ جہاں سے خندق ذرا کم چوڑی اور کم گہری تھی، کچھ اوٹ میں تھی اور قریب آنے پر ہی نظر آتی تھی۔ عکرمہ نے سات گھڑسوار اپنے ہم راہ لیے اور اُس جگہ کی طرف چل دیا۔ عکرمہ کے ہم راہ عمرو بن عبدود بھی تھا، جو قریش میں دیو کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا نہ صرف قد کاٹھ عام آدمیوں سے بڑا تھا، بل کہ وہ بہت طاقت وَر بھی تھا۔ عکرمہ گھوڑے کو دُور سے دوڑاتا ہوا لایا، خندق کے کنارے آکر گھوڑے نے چھلانگ لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا خندق کے پار چلا گیا۔ عکرمہ کے باقی ساتھی بھی خندق پھلانگ آئے۔ اس پر کافروں کے لشکر نے نعرے لگانے شروع کردیے۔ نعرے سن کر مسلمان پہرے دار دوڑتے ہوئے ادھر آئے تو عکرمہ نے کہا:

''فی الحال کوئی اور گھوڑا خندق پار کرکے نہیں آئے گا۔ جاؤ، تم میں سے جو سب سے زیادہ بہادر ہے اسے میرے سامنے لاؤ، وہ میرے آدمی کا مقابلہ کرے گا۔ اگر اُس نے میرے آدمی عمرو کو گرالیا تو ہم سب کو قتل کردینا۔

رسول اللہ ﷺ بھی اپنے جاں نثاروں کے ساتھ وہاں آگئے تھے جہاں سے عکرمہ اور اُس کے ساتھیوں نے خندق پار کی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آئے تھے۔

دیو کی طرح لمبے تڑنگے عمرو بن عبدود نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور گرجا:

''کون ہے جو میرے مقابلے میں آئے؟ میں وہ ہوں جو پانچ سو گھڑسواروں کو اکیلا شکست دے سکتا ہوں۔ میں وہ ہوں جسے آج تک کوئی نہیں گرا سکا اور نہ گرا سکے گا۔''

اللہ کے شیر حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ آپ کے ہاتھ میں نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی تلوار تھی۔

آپ عمرو بن عبدود کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ عمرو نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور بولا:

''اے ابوطالب کے بیٹے! تمھارا باپ میرا دوست تھا، کیا آج مجھے اپنے دوست کے بیٹے کو قتل کرنا پڑے گا؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ شیر کی طرح دھاڑے:

''اے عمرو! دوستی ختم ہوچکی ہے۔ میں تمھیں ایک مرتبہ کہوں گا کہ اسلام قبول کرلو۔''

عمرو بن عبدود گھوڑے سے اُترا اور کہنے لگا:

''میں نے ایک بار یہ دعوت سن لی ہے، اب دوبارہ سنوں گا بھی نہیں''۔

پھر وہ عمرو تلوار سونت کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر آگیا۔

اس نے پہلا وار بڑی تیزی اور طاقت سے کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار روکا۔ عمرو غصے میں آگیا اور پے در پے وار کرنے لگا، مگر اُس کے سامنے اللہ کے شیر تھے، جو مغروروں کا غرور خاک میں ملا چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابھی تک ایک بھی وار نہیں کیا تھا۔

قریش کے لشکر والے نعرے لگا کر اور جوشیلے شعر پڑھ کر عمرو کو جوش دلا رہے تھے، مگر پھر اُن کے نعرے تھم گئے، کیوں کہ ان کا ساتھی اب ہانپنے لگا تھا، وہ تھک چکا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو اپنی تلوار پھینک کر بجلی کی طرح عمرو پر جھپٹے۔ اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی

اور ٹانگ اُڑا کر اُسے پیٹھ کے بل گرا دیا۔ عمرو نے اپنی گردن چھڑانے کے لیے پورا زور لگایا، مگر نہ چھڑا سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کمر سے بندھا خنجر نکالا اور عمرو کی شہ رگ پر رکھ دیا اور بولے:

"اب بھی وقت ہے۔ میں تمھاری جان بخشی کر دوں گا۔"

عمرو بن عبدود نے جواب میں جو حرکت کی وہ بہت گھٹیا حرکت تھی، اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا۔

سب لوگ عمرو کی اس حرکت کو دیکھ کر حیران رہ گئے، مگر اُس وقت مارے حیرت کے ان کی چیخیں نکل گئیں جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عمرو کے سینے سے اٹھ گئے اور اپنا خنجر کمر بند سے دوبارہ لگا لیا۔ سب کا یہ خیال تھا کہ عمرو کے تھوکنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ غصے میں آ کر عمرو کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بولے:

"عمرو میں نے اللہ کے لیے تیرے ساتھ لڑائی کی تھی اور تُو نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ اب اگر میں تجھے قتل کرتا تو یہ تجھے ذاتی دشمنی اور غصے میں مارنا ہوتا۔ جا چلا جا یہاں سے۔ مسلمان صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں۔"

عمرو بن عبدود، جس نے آج تک کسی سے شکست نہ کھائی تھی، آج اپنے دس ہزار کے لشکر کے سامنے ہار گیا تھا۔ اس سے اپنی ہی ذلت برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے ایک اور گھٹیا حرکت کی۔ تلوار اُٹھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھپٹ پڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس اوچھے وار کے لیے تیار نہ تھے، مگر اُنھوں نے یہ وار ڈھال پر روکا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار بجلی کی طرح لہرائی اور عمرو بن عبدود کی گردن کٹتی چلی گئی۔

عمرو بن عبدو گر پڑا اور تڑپنے لگا۔ مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے اور کافروں کو تو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کا سردار، جو نا قابل شکست سمجھا جاتا تھا، جو اپنی طاقت پر، بہت غرور کرتا تھا، آج خاک میں پڑا تڑپ رہا تھا۔

عکرمہ اور اُس کے ساتھیوں نے یہ منظر دیکھا تو گھوڑے موڑ لیے اور خندق پھلانگ کر واپس چلے گئے۔ ان میں سے ایک بھاگتے ہوئے خندق میں گر پڑا، جسے مسلمانوں نے تیر مار کر ہلاک کر دیا۔

کافروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کریں تو کیا کریں، واپس جانے میں بڑی ذلت تھی اور آگے جانے کا راستہ نہ تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے کافروں کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ ہوا یوں کہ زبردست آندھی آ گئی۔ یہ آندھی اس قدر تیز تھی کہ کافروں کے خیمے اڑا لے گئی۔ ان کے اونٹ اور گھوڑے خوف زدہ ہو کر رسیاں تڑوا کر بھاگنے لگے۔ ابو سفیان نے یہ حال دیکھا تو گھبرا کر واپس مکے کی طرف چل دیا۔

دس ہزار کا وہ لشکر جو مکے سے یہ خواب لے کر چلا تھا کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو کچل دے گا، پسپا ہو کر جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو فتح و کامرانی سے سرفراز فرمایا تھا۔

(ماخذ: تاریخ اسلام، از معین الدین ندوی)

بقیہ: سیرت کہانی

چناں چہ میں اصحاب صفہ کو بلا کر لے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک ایک کو پلانا شروع کیا۔ جب سب کا پیٹ بھر گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:

'اب صرف میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔'

میں نے عرض کی:

'جی، یہی بات ہے۔'

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'بیٹھ جاؤ اور پینا شروع کرو۔'

میں نے پینا شروع کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے:

'اور پیو، اور پیو۔'

یہاں تک کہ میں بول اٹھا:

'قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! اب بالکل بھی گنجائش نہیں رہی۔'

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اور بسم اللہ پڑھ کر جو باقی تھا، وہ پی لیا۔"

(الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق)

......(جاری ہے)......

شوربا کھیر

عمارہ فہیم۔کراچی

ویسے تو ہماری آپی صاحبہ امی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر باورچی خانے میں گھسی رہتی ہیں۔کبھی کوئی چیز اچھی بن جاتی ہے تو کبھی ایسی کہ اس کا حال ہم سے نہ پوچھیں، وہ صرف کھانے والا ہی محسوس کرسکتا ہے۔

آج بھی ہماری امی جان رشتے داروں کے گھر گئی ہوئی ہیں اور ہماری آپی محترمہ باورچی خانے میں کچھ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں، آج کیا شاہ کار سامنے آتا ہے!

ثانیہ، احمر اور فاروق، تینوں بہن بھائی ہیں۔فاروق سب سے چھوٹا اور جاسوس طبیعت کا مالک ہے۔اپنی اسی فطرت کی وجہ سے وہ سب کی ٹوہ لگانا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔

اب بہن بھائی ہوں اور آپس میں کوئی شرارت نہ ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا، اس لیے تینوں بہن بھائی ہر وقت کچھ نہ کچھ کارنامہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

ثانیہ میں اپنی مرضی سے ہر وقت کچھ نیا کرنے کا شوق بیدار رہتا ہے، لیکن اس کی تکمیل امی کی غیر موجودگی میں ہی ہوتی ہے۔

آج بھی ثانیہ کھیر بنا کر سب کو خوش کرنا چاہتی تھی۔

گھر میں کچھ ہو رہا ہو اور جاسوس فاروق کو خبر نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔جیسے ہی ناک میں خوش بو گئی اور کان میں کھٹر پٹر کی آوازیں آنا شروع ہوئیں فاروق صاحب میں ایک تبصرہ نگار کی روح بیدار ہوگئی اور وہ تبصرہ نگاری کرتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچ گئے۔

''بلے! تم آگئے یہاں!؟ اب آ ہی گئے ہو تو تھوڑی سی مدد کردو۔''

پہلے پہل تو ثانیہ، فاروق کو دیکھ کر پریشان ہوئی کہ اب تو بن گئی کھیر، کیوں کہ فاروق صاحب کی عادت تھی ہر کام میں ٹانگ اڑانے کی۔

''جی نہیں آپی جی! آج میں کوئی مدد نہیں کرنے والا، بل کہ آج تو میں آپ کی نئی ایجاد کو منظر عام پر لانے کے لیے آیا ہوں۔''

فاروق نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا تو ثانیہ کا منہ کھلا رہ گیا اور آنکھیں باہر اُمڈ آئیں۔

''مطلب یہ کہ تم یہاں جاسوسی کے لیے آئے ہو؟''

ثانیہ نے اسے گھورا۔

''جی نہیں، میں تو آپ کو مشہور کرنا چاہتا ہوں، اس لیے بس.....

فاروق نے دانتوں کی نمائش کی۔

''اچھا! سب چھوڑیں، یہ بتائیں آج آپ بنا کیا رہی ہیں، تاکہ آپ کو مشہور کرنے کے کام کے ساتھ تھوڑی بہت آپ کی مدد بھی کرلوں۔''

فاروق کو ثانیہ کے چہرے کے تاثرات بگڑتے نظر آئے تو خود کو بچانے کے لیے اپنی خدمت پیش کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''کھیر بنا رہی ہوں، اور دیکھنا کتنی مزے دار کھیر بنے گی۔''

ثانیہ مدد کا سُن کر فوراً ٹھنڈی ہوگئی۔ اسے اس وقت ایک خدمت گار کی شدید ضرورت تھی۔ آخر پہلی بار کھیر پر زور آزمائی ہو رہی تھی۔

''اوہ کیا واقعی! اللہ کرے اچھی بنے، ورنہ چینی، دودھ، بادام، اللہ جانے کتنا نقصان ہونے والا ہے۔''

فاروق نے آخر کے جملے منہ میں بڑبڑائے، مگر لفظوں نے ثانیہ کے کانوں تک کچھ نہ کچھ رسائی حاصل کر ہی لی تھی۔

''کیا کہا؟''

ثانیہ نے فاروق کا کان مروڑتے ہوئے پوچھا۔

''ارے کچھ نہیں پیاری آپی! میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔''

فاروق کی آخری بات پر ثانیہ خاموش ہوگئی اور فاروق کو بادام اور پستے کاٹنے کے لیے دے کر چولھے پر چڑھے دودھ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

ثانیہ نے دودھ میں ابال آنے پر چینی اور پسے ہوئے چاول (ایک کلو دودھ میں صرف ایک مٹھی چاول) ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیا، ساتھ چمچ چلاتی رہی۔

کافی دیر پکنے کے بعد بھی کھیر پتلی ہی تھی۔

''یا اللہ! امی کیا جادو کرتی ہیں جو یہ کھیر گاڑھی ہو جاتی ہے، کتنی دیر سے پکا رہی ہوں، پتلی کی پتلی ہے۔ کب تیار ہوگی، کب ٹھنڈی ہوگی اور کب میں اسے سجا کر فریج میں رکھوں گی؟''

ثانیہ نے کھیر میں چمچ چلاتے ہوئے پریشان ہو کر فاروق کو دیکھ کر کہا۔

''اب میں کیا بتاؤں!''

فاروق نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

''بس اب میں اسے اتار رہی ہوں، جو بھی ہے، منہ بند کر کے کھا لینا۔''

ثانیہ نے فاروق کو گویا تنبیہ کی۔

اور فاروق صاحب نے اس وقت پوری تابع داری کا مظاہرہ کیا۔

.....☆.....

رات کے کھانے کے بعد ثانیہ نے کھیر کا پیالہ لا کر دسترخوان پر رکھی، جو دیکھنے میں کافی مزے دار لگ رہی تھی، کیوں کہ سجاوٹ میں بادام، پستے، کھوپرا وغیرہ سب استعمال کیا گیا تھا۔

''کیا بنا لیا آج ہماری بیٹی نے؟''

ابو نے پیالہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

اور ثانیہ یا کسی اور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فاروق کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی:

''محترم مہمانو! قدر دانو! کھانے والو! آج ہماری پیاری آپی نے آپ سب کے لیے کھیر بنانے کی پوری کوشش کی، مگر کھیر نے بننے سے انکار کر دیا اور وہ شوربا بن گیا۔''

فاروق نے تبصرہ کیا۔

آگے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا، وہ جانتا تھا، اس لیے اس نے بات آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے مکمل کی اور پھر دوڑ لگا دی۔

''فاروق کے بچے! تم چپ نہیں رہ سکتے، پٹو گے میرے ہاتھوں سے۔''

ثانیہ نے فاروق کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا۔

''رکو، بیٹھو ادھر۔''

دادی نے دونوں کو بلایا اور پھر ثانیہ اور فاروق کی امی کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوئیں:

''بھئی شازیہ! ہماری پوتی نے کھیر تو مزے دار بنائی ہے، بس اس میں چاول ذرا کم ہیں اور پیس کر ڈال دیے گئے ہیں، اس لیے یہ کھیر کی جگہ فرنی بن گئی ہے۔''

''کیا! ہرنی؟''

فاروق نے چمچ منہ سے نکالتے ہوئے آنکھیں باہر نکال کر پوچھا۔

''نہیں لڑکے! فرنی، اس میں چاول پیس کر ڈالتے ہیں اور کھیر کی نسبت کم چاول ڈالے جاتے ہیں اس وجہ سے یہ پتلی اور کھیر گاڑھی ہوتی ہے۔''

دادی نے آرام سے سمجھاتے ہوئے ثانیہ کو انعام بھی دیا۔

''مطلب یہ ہوا کہ ہماری آپی کھیر بنانے چلیں اور فرنی بنا آئیں!''

فاروق کی اس بات پر دسترخوان پر موجود تمام افراد مسکرانے لگے۔

اعلان

کاغذ کی قیمت، پرنٹنگ اور دیگر اخراجات کی وجہ سے آپ کے ماہ نامہ ''ذوق و شوق'' کی قیمت میں =/10 روپے کا اضافہ ہوگیا ہے، یعنی اب ماہ نامہ ''ذوق و شوق'' قیمتی ہو کر =/80 روپے کا ہوگیا ہے۔

اب سالانہ خریداری مع رجسٹری ڈاک =/1000 روپے کے بجائے =/1100 روپے اور عام ڈاک =/750 روپے کے بجائے =/850 روپے ہوگئی ہے۔

محنت کا صلہ

شیراز نثار۔ سرگودھا

آج وہ کتابیں بھی کباڑیے کو بیچ آیا تھا۔ گھر کے حالات ہی اس قابل نہ تھے کہ وہ پڑھ سکتا۔ کچھ اس کی دل چسپی بھی تو نہیں تھی پڑھائی میں، اور گھر میں فارغ رہنا کسے بُرا لگ سکتا ہے بھلا! اماں نے تو سوچا کہ بیٹا احساس کر رہا ہے، جانتا ہے کہ ماں باپ پڑھائی کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے، اس لیے چھوڑ دی پڑھائی۔ بیٹے کی پڑھائی چھڑوا کر جیسے اماں کا کافی بوجھ ہلکا ہوا تھا، لیکن دل ہی دل میں یہ فکر بھی پنپ رہی تھی کہ بیٹے کے مستقبل کا کیا ہوگا، لیکن پڑھائی کی جائے تو گھر کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں، بس یہی سوچ کر وہ چپ ہو رہیں کہ اللہ بہتر کرے گا۔

وہ کتابیں بیچ کر سیدھا میدان میں آ گیا، جہاں اس کے بہت سے دوست کھیل رہے تھے۔ وہ بھی کھیل میں مشغول ہو گیا۔

کھیلتے ہوئے ناصر نے اپنے دوست کو بھی بتایا کہ اس نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔

''تمھاری تو موج ہو گئی ناصر!'' دوست نے بھی رشک کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

شام ہوتے ہی سردی بڑھنے لگی تو سب گھروں کی جانب چل دیا۔ دوستوں میں بات پھیل چکی تھی کہ ناصر نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔

کچھ دوست اسے جلی کٹی بھی سنا رہے تھے، پڑھائی چھوڑنے کے نقصان بھی سمجھا رہے تھے، لیکن سچ تو یہ تھا کہ دل ہی دل میں سب اس کی قسمت کو سراہ رہے تھے۔

جنوری کے اوائل دن تھے۔ شام ہوتے ہی جہاں بچے بڑے لحافوں میں دبکنے کی سوچتے وہیں ماسٹر شکیل اپنی بیٹھک میں آگ جلا لیتے۔ مغرب کی نماز کے بعد بچے ان کی بیٹھک میں پہنچ جاتے اور آگ کے گرد بیٹھ کر ماسٹر صاحب سے مزے مزے کی کہانیاں سنتے۔ اس طرح بچے سردی سے بھی محفوظ رہتے اور ماسٹر صاحب کہانیوں کے ذریعے ان کی اصلاح بھی کرتے۔

ماسٹر شکیل علاقے کے سرکاری اسکول میں معلّم رہے تھے۔ ابھی دو سال ہوئے تھے انھیں ریٹائرمنٹ ملے، اب وہ شہر کے ایک لائبریری میں جاتے رہتے تھے اور کبھی کوئی کہانیوں کی کتاب بھی لے آتے تھے، جس میں سے بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سناتے تھے۔

آج بھی بچے سر شام ہی جمع ہو چکے تھے۔ ماسٹر صاحب کو بھی بچوں کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ ناصر نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

جب سب بچے جمع ہو چکے تو ماسٹر صاحب نے کہا:

''تو بچو! آج کی کہانی شروع کرتے ہیں۔''

سب بچے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ایک بچہ ہے، بل کہ یوں کہو کہ ایک نوجوان ہے، کبھی وہ بچہ ہوا کرتا تھا۔

وہ آٹھویں جماعت میں تھا جب گاؤں کے وڈیرے کے بیٹے کو پرچے میں نقل کرتے دیکھ کر اُستاد صاحب سے شکایت کی تھی، جس کے نتیجے میں وڈیرے نے اس کے باپ کو اُسی رات اتنا پٹوایا تھا کہ ساری رات درد سے کراہنے کے بعد صبح ہونے سے پہلے وہ دم توڑ چکا تھا اور پچھلی طرف کے کھیت سے اس کی لاش ملی تھی۔ باپ کی لاش دیکھ کر وہ لڑکا حواس باختہ ہو گیا تھا۔

باپ کی لاش کے پاس اسے ایک زنجیر ملی تھی جسے اس نے کئی دفعہ وڈیرے کے ڈیرے پر دیکھا تھا۔ وہ سب سمجھ گیا تھا اور زنجیر اُٹھا کر ماں کے پاس لے گیا تھا۔ ماں نے اس سے وہ زنجیر لے کر پھینک دی اور اُسے سہا کر سمجھا کر چپ کروا دیا تھا کہ آئندہ یہ بات کسی سے نہ کہے، ہم ان وڈیروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چاہے سارا گاؤں بھی گواہی دے دے، ہم کچھ نہیں کر سکتے ان بڑے لوگوں کا۔''

وہ چپ ہو گیا تھا، لیکن نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے وہ زنجیر اُٹھا کر چھپا لی تھی۔

اس کے بعد اُس کی ماں اسے شہر لے گئی تھی۔ اس کے ماموں نے انھیں ایک مکان کرائے پر لے دیا تھا اور اُس کے بعد شاید انھیں بھول گئے تھے۔ اسے اپنی پڑھائی چھوڑنی پڑی تھی۔ ماں نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ ایک لائبریری میں ملازم ہو گیا تھا۔

لائبریری کے مالک نے اس سے پوچھا تھا کہ تم پڑھتے کیوں نہیں ہو؟

''کیوں کہ پیٹ بھرنے کے لیے کام کرنا ضروری ہے۔'' اس نے برجستہ جواب دیا تھا۔

''کام کرنے کے لیے پڑھائی چھوڑنا ضروری ہے کیا؟'' دوسرا سوال ہوا تھا۔

وہ چپ رہا۔

''کیا تمھیں شوق نہیں پڑھنے کا؟ اگر تمھیں پڑھنے کا شوق ہوتا تو تم پڑھائی کے ساتھ بھی کام کر سکتے تھے۔ تم ارادہ کر لو پڑھنے کا تو تم پڑھ بھی لو گے اور کام بھی کر لو گے۔'' اس کے خاموش رہنے پر اُنھوں نے مزید کہا۔

اس دفعہ اس نے صرف گردن ہلائی۔

''تمھارے ابو کی وفات کیسے ہوئی تھی؟'' ایک اور سوال کیا گیا۔

''انھیں وڈیرے نے مار دیا، صرف اس لیے کہ میری وجہ سے اس کے لڑکے کی اسکول میں بے عزتی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے نقل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا تھا۔'' کتابیں صاف کرتے ہوئے اس نے گردن جھکا کر جواب دیا، جیسے اس سب میں وہی قصوروار ہے، نہ وہ اس لڑکے کی بے عزتی کرواتا نہ اسے یہ دن دیکھنا پڑتا۔

''تم اپنے کیے پر شرمندہ کیوں ہو؟ تمھیں شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے صحیح کیا تھا اور جب کچھ اچھا کام کرتے ہیں تو اُس پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے، اپنے کیے کو صحیح ثابت کرنا چاہیے، سب کی مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹ جانا چاہیے۔'' انھوں نے اس میں خود اعتمادی پیدا کرنی چاہی۔

''لیکن اب میرے ابو تو واپس نہیں آسکتے نا! میں جو کچھ بھی کر لوں؟'' اب اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں، کتابیں صاف کرتے اس کے ہاتھ سست پڑ گئے تھے۔

''لیکن تم اپنے ابو کے ساتھ کی ہوئی زیادتی پر انصاف لے سکتے ہو، تم ظالموں کو سزا دلوا سکتے ہو۔'' وہ اسے سمجھانے لگے۔

''زندگی بس ایک دفعہ ملی ہے۔ اب اسے اچھے طریقے سے گزارنا ہے یا یوں ہی گزر جانے دینا ہے، یہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔ یہ وقت تمھاری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا، اسے ضائع نہ جانے دو۔''

انھوں نے پُرجوش انداز میں کہا تھا۔

''لیکن امی کہتی ہیں کہ ہم ان بڑے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے! سارا گاؤں بھی ہمارے ساتھ ہوگا تو بھی ہم انھیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکیں گے، اور پھر اس سب کے لیے کیس کرنا ہوگا، کوئی بڑا وکیل کرنا ہوگا، ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' اس کا افسوس سے پُر لہجہ آخر میں سوالیہ ہو گیا تھا۔

''کچھ بگاڑ کیوں نہیں سکتے! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ یوں ہار مان لینے سے کچھ نہیں ہوگا اور ظالم مزید نہ جانے کتنے ظلم کرے گا، کتنوں کو یتیم کرے گا، اور وکیل نہیں کر سکتے تو تم خود وکیل بن سکتے ہو، تم پڑھو اور مہنگے وکیلوں سے بھی بہترین بن کر دکھاؤ۔ تم سب کر سکتے ہو اگر تم عزم کر لو۔ تم سب کو ہرا سکتے ہو اگر تم حق پر ہو۔''

مالک نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ سمجھ گیا تھا۔ آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کی چمک ابھر آئی تھی۔ کتابوں کی الماری کو صاف کرتے اس کے ہاتھ رکے۔

''ہاں، میں انصاف لوں گا۔ میرے پاس تو ایک ثبوت بھی ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہ خوشی خوشی گھر کی طرف بھاگا تھا۔

''لیکن پڑھوں گا تو یہاں کام کیسے کروں گا؟'' اگلے دن وہ اپنا نیا مسئلہ لے آیا تھا۔

''تم صبح جلدی، اسکول جانے سے پہلے یہاں آیا کرو، میرے ساتھ دکان کھلوا دیا کرو، کچھ جھاڑ پونچھ وغیرہ کر کے وقت پر اسکول جایا کرو اور اسکول سے سیدھے یہاں آیا کرو، اس طرح کام بھی ہوگا، ساتھ تمھاری پڑھائی بھی ہوتی رہے گی۔'' انھوں نے اس کو ترتیب بتائی اور وہ خوش ہو گیا۔

اب مسئلہ تھا اسکول میں داخلے کا۔ لائبریری میں چوں کہ میں بھی جاتا تھا اور میں اس لڑکے سے اچھی طرح واقف بھی تھا، اس لیے میں نے ہیڈ ماسٹر سے بات کر کے اسے نہم جماعت میں داخلہ دلوادیا تھا۔

اس نے مجھے بہت دعائیں دی تھیں۔

اب وہ لڑکا بہت خوش تھا۔

اب کام یابی اس کے ہاتھ میں تھی۔

وہ تھکن کے باوجود محنت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیتا تھا۔ اس کا اسکول صبح آٹھ بجے شروع ہوتا تھا، وہ سات بجے سے بھی پہلے دکان پر پہنچ جاتا، دکان کھلواتا، تھوڑی صفائی وغیرہ کرتا اور بستہ اٹھا کر آٹھ بجے اسکول پہنچ جاتا۔ اسکول سے سیدھا دکان پر آتا اور بستہ رکھ کر اپنے کام میں لگ جاتا۔ اسے جب گاہکوں اور کاموں سے تھوڑی فرصت ملتی تو وہ دکان میں ہی بستہ کھول کر پڑھنے بیٹھ جاتا تھا۔ ذرا کوئی کام ہوتا تو کر کے پھر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ اس نے تھکن کا لفظ ہی اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

وہ خود کو اتنی دیر بھی فارغ ہونے نہیں دیتا تھا کہ بیٹھ کر یہی سوچ سکے کہ وہ تھک رہا ہے۔ کبھی بخار میں بھی چھٹی نہ کرتا تھا اور جب کوئی اسے آرام یا چھٹی کرنے کا مشورہ دیتا تو وہ جھٹ سے کہہ دیتا کہ ایک دن چھٹی کر لی تو روز چھٹی کرنے کا دل چاہے گا۔

اسے ایک دو کتابوں کی ضرورت پیش آئی جو وہ خرید نہیں سکتا تھا۔ امی سے وہ پیسے مانگ نہیں سکتا تھا۔ امی کو اپنی دوائیں بھی لینی ہوتی تھیں، اوپر سے گھر کے دوسرے اخراجات بھی تھے۔ اس کی پریشانی دیکھ کر لائبریری کے مالک نے لائبریری سے وہ کتابیں لے لینے کی پیش کش کی، لیکن اس نے منع کر دیا۔

اس نے اپنے استاد سے کتابوں کے لیے ایک ہفتے کا وقت لیا اور وعدہ کیا کہ اگلے ہفتے وہ کتابیں لے آئے گا، تب تک کلاس کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ پڑھے گا۔

اسی رات وہ محلے کے دکان دار کے پاس گیا۔ اس سے کاغذ اور گوند لی اور کافی دیر تک صحن میں بیٹھ کر لفافے بناتا رہا۔ صبح وہ لفافے دکان دار کو دے کر پیسے لے آیا۔ اسی طرح تین دن مسلسل محنت کے بعد چوتھے دن وہ وہی کتابیں ٹھیلے والے سے پرانی حالت میں، لیکن کم قیمت پر حاصل کرنے میں کام یاب ہو چکا تھا۔

ایک عجیب سی خوشی اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

خودداری.....

جیت.....

سرشاری.....

اور اِس کے ساتھ ساتھ محنت! بلاتکان محنت.....

اور یہ اسی سب کا نتیجہ تھا کہ نہم کے نتیجے میں اس نے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسکول کی جانب سے اس کی دہم جماعت کی تعلیم مفت ہو گئی تھی۔

شاید قسمت بھی اس کے ساتھ تھی اور اُس کی لگن کا بھی کمال تھا کہ دہم جماعت کا بہترین نتیجہ آنے پر اُسے حکومت کی جانب سے وظیفہ دیا گیا تھا، جس کی بنا پر وہ آگے مفت پڑھ سکتا تھا۔

زندگی نے اسے آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا تو اُس نے بھی اپنی لگن، محنت، ہمت اور عزم میں کمی نہ آنے دی تھی، بل کہ اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔

وہ کام یابیاں چنتا گیا اور مزید آگے بڑھتا گیا، پھر وہ وقت بھی آیا تھا جب اس نے وکالت بھی پڑھ لی تھی۔

اس نے خود اپنے باپ کا کیس لڑا تھا۔

کل وہ مجھے ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو سال تک مسلسل ان ظالموں کو اپنے کیس میں الجھائے رکھا اور آخر سزا دِلوادی۔ ان کے بڑے بڑے وکیلوں کو ہرا دیا۔ اس نے بہت سے بچوں کو یتیم ہونے سے بچا لیا ہے۔

اس نے بتایا کہ اس زنجیر سے اسے بہت فائدہ ہوا جو اُس نے اپنے باپ کے مرنے کے وقت سنبھال لی تھی۔

میں نے اسے مبارک باد دی۔

اس نے اب بھی محنت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔

ماسٹر شکیل کہانی سنا کر خاموش ہو چکے تھے۔

ناصر کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ انسان تو وہی ہے جو بڑی بڑی مشکلات کے سامنے ڈٹ جائے۔ ایک دفعہ عزم کر لے تو اپنے عزم کو پست نہ ہونے دے۔

''ابھی تو میرے پاس وقت ہے، ابھی تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔''

وہ آج کی کہانی کا مقصد سمجھ گیا، اس کی آنکھیں ایک نئے جذبے، ہمت اور عزم کے تحت چمک اٹھی تھیں۔

وہ بیٹھک سے باہر کی جانب بھاگا۔ ابھی تو اُسے صبح اپنی کتابیں بھی کباڑیے سے واپس لینی تھیں۔

ماسٹر شکیل اسے دیکھ کر مسکرائے، پھر باقی بچوں کی طرف دیکھا۔

اکثر بچوں نے تو آج کی کہانی اونگھتے ہوئے گزاری تھی۔

کہیں آپ نے بھی تو.....

مہمان اور میزبان

انصار احمد معروفی قاسمی۔ یوپی، انڈیا

مجلسِ نبوی میں آئے ایک مہمانِ رسول
بزم میں حاضر بہت سے تھے فدایانِ رسول
بولے: میں بھوکا کئی دن سے رسول اللہ! ہوں
رحم مجھ پر کیجیے ، حالت میں اپنی کیا کہوں؟
آپ نے فرمایا: ''جس کے گھر یہ کھانا کھائے گا
میں دعا دوں گا ، وہ جنت میں یقیناً جائے گا''
ایک انصاری اٹھے اور اپنے گھر پہ لے گئے
جاکے گھر بولے: ''ہیں یہ مہماں رسول اللہ کے''
بیوی بولی: ''جو بھی کچھ ہے ، ہے وہ بچوں کے لیے
ہم ہیں بھوکے ، اور نہیں ہے کچھ بھی بھوکوں کے لیے''
بولے: ''بچوں کو سلادو ، ان کا دل بہلا کے تم
اور بجھا دینا دِیا حجرے میں جلدی آ کے تم
جو بھی بچوں کا ہے کھانا ، ہم کھلا دیں گے انھیں
ساتھ ہم بھی کھا رہے ہیں ، یہ جتادیں گے انھیں''
اس طرح بھوکوں نے اس مہمان کو کھانا دیا
بیوی ، شوہر نے جگر پر اپنے پتھر دھر لیا
یہ ادا انصار کی اللہ کو آئی پسند
اور کہا قرآن میں ان کو خدا نے ''درد مند''

کھڑکھاند گروپ
مچھلی کے شکار پر

فتح محمد عرشی۔ پائی خیل

کھڑکھاند گروپ کو اِس مرتبہ عجیب سوجھی تھی، بل کہ کھڑکھاند گروپ کو تو ہر بار عجیب ہی سوجھتی ہے۔ اس مرتبہ وہ مچھلی کے شکار پر تُل گئے تھے۔ منصوبہ خالصتاً دادابڈی کا تھا!

''ناممکن!'' گنجے والا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نے سنا نہیں، رَچھ کے بغیر مچھ نہیں پکڑے جاتے۔'' (جال کے بغیر مچھلیاں نہیں پکڑی جاسکتیں۔)

''ارے تم غم نہ کرو، جال بھی کہیں سے لے آئیں گے، تم ہمت تو کرو!'' دادابڈی نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''چلو مرغی نہ سہی مچھلی سہی، سنا ہے مچھلی معدے کے لیے اِکسیر ہے!''

مبارکاں نے چھوٹے والا کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے! میرے منہ نہ لگو۔'' چھوٹے والا نے اسے گھورا۔ ''ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔''

''تم سے بُرا تو ویسے بھی کوئی نہیں!''

مبارکاں نے بے اختیار کہا اور سب کے منہ سے قہقہے ابل پڑے۔ چھوٹے والا بھی شرمندہ ہو کر ہنس دیا۔

''اچھا، اب مذاق ختم، کل شکار پر جانے کی تیاری کرو!'' دادابڈی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''ارے بھائی! تیاری کیا کرنی ہے؟ بس منہ ہاتھ دھو کر چل پڑیں گے تمھارے ساتھ، جال تو تمھی نے لانا ہے ناں!''

ملنگی نے بھی چپ کا روزہ توڑتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ!'' گنجے والا نے جلدی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مچھلی مسالا اور دیگر لوازمات آج ہی لے لیں، کل پتا نہیں کب واپسی ہو؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ؟'' چھوٹے والا نے چٹخارا لیا۔

اور پھر کھڑکھاند گروپ مسالا جات لینے نکل پڑا۔

.......☆.......

گاؤں سے دو، تین میل دور کئی لمبی چوڑی صاف پانی کی جھیلیں تھیں، لیکن ان کی گہرائی بس چار پانچ فٹ ہی رہی ہوگی، اِن میں چھوٹی موٹی مچھلی آرام سے مل جاتی تھی۔ موٹی اس طرح کہ کبھی کبھی دریائے سندھ کا سیلابی ریلا آتا تھا تو ساتھ بڑی بڑی مچھلیاں بھی بہا کر لے آتا تھا۔ ویسے ان جھیلوں سے عموماً ''شوقیہ فن کار'' ہی فیض یاب ہوتے تھے!

نکلتے نکلتے کچھ دیر ہوگئی اور کھڑکھاند گروپ دس بجے ہی جھیل پر پہنچ پایا۔ جاتے ہی دادابڈی اور گنجے والا نے جال تیار کیا اور جھیل میں ایک مناسب جگہ پر پھینک دیا۔

ملنگی مچھلی پکڑنے والے کانٹوں پر کینچوے پُرو رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مچھلیاں ان کی دیوانی ہوتی ہیں، اس لیے فوراً ہی نگلنے آجاتی ہیں اور اِس طرح ہم جیسے گناہ گار اِنسانوں کی پیٹ پوجا کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

چھوٹے والا نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کیا واقعی!؟''

''کیوں نہیں، ابھی دیکھ لینا!'' ملنگی نے چہک کر کہا۔ ''کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے!''

''چلے آئیں گے!؟'' مبارکاں نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن مچھلیاں تو مؤنث ہوتی ہیں!''

''مذکر مؤنث کے چکر میں پڑو گے تو بھوکے رہو گے۔'' ملنگی نے فلسفہ جھاڑا۔ ''پیٹ مذکر مؤنث کبھی نہیں پوچھتا!''

ادھر تو یہ نوک جھونک جاری تھی اور اُدھر گنجے والا اور دادابڈی جال کھینچ رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے، کوئی مچھلی نہیں پھنسی، جال خالی معلوم ہوتا ہے!'' گنجے والا نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں دوست!'' دادابڈی نے اسے تسلی دی۔ ''ابھی تو پہلی مرتبہ ہے!''

اور پھر واقعی جال خالی ہی نکلا۔

''میرا خیال ہے، پرلے کنارے پر جال ڈالیں، شاید اُدھر کوئی دانہ

پھنس جائے!''

گنجے والا نے مشورہ دیا اور پھر وہ دوسرے کنارے پر چلے گئے، لیکن ادھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اِدھر ملنگی بھی کانٹا ڈالے بیٹھا تھا اور مبارکاں اور چھوٹے والا دل چسپی سے یہ شغل دیکھ رہے تھے کہ اچانک ڈور کو ایک جھٹکا لگا اور سرکنڈا پانی میں ڈوب گیا!

''پھنس گئی!'' ملنگی نے نعرہ لگایا اور اِحتیاط سے ڈور کھینچنے لگا۔

دادا بڈی اور گنجے والا بھی جال کو وہیں چھوڑ کر دوڑے آئے۔ ملنگی نے ڈور کھینچتے ہوئے کہا:

''لگتا ہے، مچھلی کافی موٹی تازی ہے، خاصی وزنی ہے!''

سب کا تجسس کے مارے بُرا حال تھا مبارکاں اور چھوٹے والا کے چہرے خوشی سے کِھل رہے تھے!

آخر خدا خدا کر کے ڈور باہر آئی اور سب کے منہ سے بے اختیار قہقہے ابل پڑے، ایک موٹا تازہ بزرگ ٹائپ کچھوا کانٹے میں پھنسا ہوا تھا۔

''مبارکاں مبارکاں! میرا خیال ہے، یہی ایک نمونہ ہی کافی ہے!''

مبارکاں نے قہقہہ لگایا۔

''دھت تیرے کی!''

ملنگی نے جھلا کر کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں یار!'' مبارکاں ہنس ہنس کر دہرا ہو گیا۔ ''کچھوا مذکر ہے تو کیا ہوا؟ پیٹ مذکر مؤنث کبھی نہیں پوچھتا!''

ملنگی نے جھلّا کر کچھوے کو ایک عدد لات رسید کرنا چاہی، لیکن اُس کے چکنے خول سے پھسل کر دھڑام سے گرا۔ ایک زبردست قہقہہ ابل پڑا اور ملنگی نے کچھوے کے آباؤ اجداد کو بھی نہ بخشا۔

''تم نے تو اپنا ''فن'' دکھا دیا، اب ہمارا کمال دیکھنا'' دادا بڈی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، تمھارا کمال بھی دیکھ لیا، دو گھنٹے سے ایک جھینگا بھی نہیں پکڑ سکے!'' ملنگی نے جل کر کہا۔

''ارے چھوڑو،

بھئی پہلے ہم کم پانی میں جال ڈالے ہوئے تھے۔ اب دیکھنا، گہرے پانی سے کیسی کیسی مچھلیاں پکڑتے ہیں!'' دادا بڈی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''آؤ، اس طرف چلیں۔''

اور وہ سب دادا بڈی کے پیچھے چل پڑے۔ تھوڑی دور جا کر دادا بڈی ایک اور جھیل کے کنارے رکا۔ یہاں شاید گہرے کھڈ تھے، کیوں کہ پانی کافی گہرا دکھائی دے تھا۔

دادا بڈی نے چہک کر کہا:

''اب دیکھنا ہمارا کمال!''

یہ کہہ کر اُس نے جال کو پھیلایا اور پانی میں پھینک دیا، اس کے ساتھ ہی فضا دادا بڈی کی چیخ سے گونج اُٹھی۔

دراصل جوش میں وہ بالکل کنارے پر چلا گیا تھا، وہاں کیچڑ تھا۔ جب وہ جال پھینکنے لگا تو اُسی جھونک میں پھسل کر خود بھی پانی میں جا گرا۔ بوکھلاہٹ میں جال بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دادا بڈی ڈبکیاں کھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ الٹے سیدھے ہاتھ مارتے ہوئے چلّا رہا تھا:

''بچاؤ، بچاؤ!''

چھوٹے والا نے نہ سوچا نہ سمجھا اور دادا بڈی کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ جوش میں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ خود بھی تیرنا نہیں جانتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی غوطے کھانے لگا!

گنجے والا، مبارکاں اور ملنگی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بازو لمبا کر کے انھیں پکڑنے کی کوشش بھی کی، لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ ہاتھ کی پہنچ سے باہر تھے۔

اچانک مبارکاں کو ہوش آیا اور اُس نے جال پکڑ کر اُس کا دوسرا کنارا دادا بڈی اور چھوٹے والا کی طرف پھینک دیا اور چلا کر کہا:

''جال پکڑو فوراً۔''

''بہت خوب مبارکاں! بہت خوب!'' گنجے والا چہکا۔

جیسے تیسے دادا بڈی اور چھوٹے والا نے جال پکڑ ہی لیا اور پھر اُنھیں باہر کھینچ لیا گیا، لیکن ان کے حلق سے کافی پانی اُتر چکا تھا۔ کچھ دیر تو وہ بے دم پڑے رہے، پھر ذرا سنبھلے تو مبارکاں کی چہکار اُن کے کانوں میں پڑی:

''مبارکاں، مبارکاں! آپ کو تو نئی زندگی ملی ہے، اسی خوشی میں مرغی آگئی آپ پر!''

''منہ میٹھا کرا دیں گے دوست! پروانہ کرو۔'' دادا بڈی نے کہا اور چھوٹے والا نے بُرا سا منہ بنا لیا۔

خیر، مچھلی پکڑنے کا تو اَب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے واپس چل پڑے۔

واپسی پر اچانک ان کی نظر ایک مچھلی بیچنے والے پر پڑی۔ اسے دیکھ کر گنجے والے کا چہرہ کِھل اٹھا۔

''کام بن گیا۔ شکر ہے، مچھلی مل گئی، ورنہ بیگم کے سامنے بڑی شرمندگی ہوتی، اب تو اُسے ماننا ہی پڑے گا کہ ہم مچھلی کے ماہر شکاری ہیں۔''

مچھلی فروش نے مسکرا کر کہا:

''جناب! آپ جیسے قدر دانوں ہی کی بدولت ہم اچھی خاصی کمائی کر لیتے ہیں۔''

''ایک ایک کلو کے دو دانے دے دو۔''

گنجے والا نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''ایک کلو ہمارے لیے بھی لے لو!''

چھوٹے والا نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ہاہاہا! خرچہ کرو پیارے!'' دادا بڈی چہکا۔

گنجے والا انکاری تھا۔

مبارکاں نے چھوٹے والا کو آنکھ مارتے ہوئے کہا:

''کوئی بات نہیں۔ ہم تو اپنے بھتیجے سے صرف اتنا کہیں گے کہ ''بیٹا! امی سے پوچھو کہ مچھلی باسی تو نہیں تھی؟ کیوں کہ مچھلی والا کہہ رہا تھا کہ گارنٹی ہے، اگر باسی ہوئی تو پیسے واپس!''

''تم م م..... خیر سمجھوں گا تم سے بھی!'' گنجے والا نے اسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا اور سب بے اختیار ہنس پڑے۔

پھر گنجے والا کی جان تبھی چھوٹی جب اس نے ایک کلو مچھلی کھڑکھاند گروپ کے لیے بھی لی۔

چھوٹے والا اور دادا بڈی سو روپے کے شکر پارے لے آئے تھے۔

اگرچہ گنجے والا کے خیال میں ان کا معیار کافی کمزور تھا اور اُن کا شجرۂ نسب پتھر کے دور سے جا ملتا تھا، کیوں کہ ان میں ویسی ہی ''دندان شکن'' قسم کی سختی پائی جاتی تھی، لیکن مبارکاں نے ایک عدد ہتھوڑا برآمد کر کے مسئلہ کچھ نہ کچھ حل کر دیا تھا!

دوستو! کھڑکھاند گروپ میں سب چلتا ہے!

سوال آدھا جواب آدھا ۲۸

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۱، جنوری تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو اِنعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

❶ قرآن مجید کی نزولی ترتیب میں چوالیسویں سورت ''سورۂ مریم'' ہے (یہ قرآن مجید کی واحد سورت ہے جو کسی خاتون کے نام سے منسوب ہے)..... بتایئے ''سورۂ کوثر'' نزولی ترتیب میں کون سے نمبر پر ہے؟

❷ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ رشتے میں حضور نبی کریم ﷺ کے چچا تھے..... بتایئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حضور نبی کریم ﷺ سے کیا رشتہ تھا؟

❸ قبول اسلام کے وقت خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عمر 38 سال تھی..... بتایئے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کس عمر میں اسلام قبول کیا تھا؟

❹ ''سالِ جلالی'' اس سن کو کہتے ہیں جو سلطان جلال الدین سلجوقی کے عہدِ حکومت میں ایجاد ہوا تھا..... بتایئے ''سالِ رومی'' کس سن کو کہتے ہیں؟

❺ ''کتاب المیزان''، مشہور مسلمان کیمیا دان جابر بن حیان کی تصنیف ہے..... کیا آپ جانتے ہیں کہ ''کتاب المناظر'' کس سائنس دان نے لکھی تھی؟

❻ ''درّہ نمنی'' (بلندی: 15,300 فٹ) کا تعلق میانمر (سابقہ برما) سے ہے..... بتایئے ''درّہ بابوسر'' (بلندی: 13,600 فٹ) کا تعلق دنیا کے کس ملک سے ہے؟

❼ پاکستان کی سب سے بلند پہاڑی چوٹی K-2 (بلندی: 28,250 فٹ) پہلی بار 31، جولائی 1954ء کو سَر کی گئی تھی..... بتایئے پاکستان کی مشہور پہاڑی چوٹی ''نانگا پربت'' پہلی بار کب سَر کی گئی تھی؟

❽ انسانی بازو میں 32 ہڈیاں ہوتی ہیں..... بتایئے انسان کی ٹانگ میں کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟

❾ زلزلے کے جھٹکوں کو ریکارڈ کرنے والا آلہ ''سیسموگراف'' (Seismograph) کہلاتا ہے..... آپ یہ بتایئے کہ وہ آلہ جسے زمین کے مسائل کا حساب لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟

❿ ''اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے: ''خطرناک کام شروع کر دیا تو تکلیف سے کیا ڈرنا''..... کیا آپ کو معلوم ہے کہ ''اونچی دکان پھیکا پکوان'' کا کیا مطلب ہے؟

احمد بہت دیر سے موبائل لیے بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُس کے منہ سے کبھی ''واہ!'' کی آواز آتی تو کبھی ''کیا بات ہے!'' کی تو کبھی ''واو!'' کی آواز آتی۔ نانو بہت دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہے ہو احمد!؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نانو! آپ کو دکھاؤں، یہ دیکھیں، یہ سوئیز رلینڈ کی وڈیو، یہ لندن کی تصویر، یہ پیرس۔'' وہ جلدی جلدی تصویریں دکھاتا جا رہا تھا۔

''تو ہمارا ملک صاف کیوں نہیں ہو سکتا؟'' نانو نے پوچھا۔

''اس لیے کہ لوگوں کو یہ سمجھ ہی نہیں ہے کہ ہر جگہ کچرا نہیں پھینکنا چاہیے۔'' احمد بولا۔

''ویسے یہ 'لوگ' کون ہوتے ہیں؟'' نانو نے پوچھا۔

اتنے میں علی، یوسف اور عفان بھی آ گئے۔

''آپ دونوں آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' علی نے نانو کے پاس

تقدیر نہیں بدلتی

مریم شہزاد۔ کراچی

''نانو! یہ کتنے خوب صورت اور صاف ستھرے شہر ہیں نا!؟''

''ہاں بھئی بہت اچھے ہیں، مگر ہمارا پاکستان سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔'' نانو نے کہا۔

''کوئی نہیں نانو! بس کچھ علاقے یا کچھ شہر ہی ہیں صاف ستھرے، ورنہ تو ہر جگہ لوگ کچرا پھیلا دیتے ہیں۔ سمندر میں بھی اتنا کچرا ہوتا ہے کہ بس! یہ دیکھیں (اس نے ایک تصویر اور کھولی)۔ یہ سمندر کتنا صاف اور خوب صورت ہے!'' احمد نے چڑ کر کہا۔

بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا ہوا تم لوگ بھی آ گئے، بھئی میں احمد سے کہہ رہی تھی کہ پاکستان سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور احمد کہتا ہے کہ دوسرے ملک زیادہ اچھے ہیں، کیوں کہ وہ صاف ستھرے ہیں۔'' نانو نے سب کو بتایا۔

''ویسے نانو! اپنے ملک کو گندا کہنا تو نہیں چاہیے، مگر کہیں اتنا سارا پانی کھڑا ہوتا ہے، کہیں گٹر کھلے ہیں اور کہیں کچرا ہی کچرا ہے۔'' یوسف نے بھی احمد کی تائید کی۔

''میں احمد سے یہی تو پوچھ رہی تھی کہ ہمارے ملک کو کون گندا کرتا ہے اور دوسرے ملکوں کو کون صاف رکھتا ہے؟'' نانو بولیں۔

''لوگ، نانو! لوگ۔ یہ جو سارے لوگ چلتی گاڑیوں سے کچرا پھینک دیتے اور گھروں سے باہر گندگی پھیلاتے ہیں۔'' عفان بھی بول اٹھا۔

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ 'لوگ' کون ہوتے ہیں؟'' نانو نے مسکرا کر کہا تو وہ سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ آخر احمد بولا:

''کیا مطلب نانو!؟ لوگ، لوگ ہوتے ہیں اور کون ہوتے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی کہ لوگ، لوگ ہوتے ہیں۔ صحیح طرح سوچ کر بتاؤ۔'' نانو نے کہا۔

وہ سب کچھ بھی سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں، لہٰذا وہ سوالیہ نظروں سے نانو کو دیکھنے لگے۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ جب تم تینوں اندر آئے تھے تو میں نے کیا کہا تھا؟''

''آپ نے کہا تھا کہ اچھا ہوا کہ تم لوگ بھی آ گئے۔'' علی جھٹ بولا تو نانو مسکرانے لگیں۔

''تو تم تینوں بھی لوگ ہی ہوئے نا! تو کیا تم لوگ گندا کرتے ہو اپنا ملک؟'' انھوں نے کہا۔

''نہیں نانو! ہمیں تو امی پارک میں بھی کچرا دان کے علاوہ کچرا نہیں پھینکنے دیتیں۔'' احمد نے کہا۔

''اور میں نے اس دن کانفٹن میں بھٹا کھا کر پانی میں اچھال دیا تو امی اتنا ناراض ہوئیں کہ بس، حالاں کہ سب پانی میں ہی اچھال رہے تھے۔'' علی بول اٹھا۔

''تو ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ لوگ اس طرح غلط کام نہ کریں جس سے ہمارا ملک گندا ہو؟'' نانو نے پھر سوال کیا۔

سب کچھ دیر سوچنے لگے۔ اچانک احمد بولا:

''آئیڈیا! ایسا کرتا ہوں، میں فیس بک پر ڈال دیتا ہوں اور تم سب اسے شیئر کر دینا اور پھر ہمارے دوست اسے اور آگے شیئر کر دیں گے۔ اس طرح سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اپنے ملک کو صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔''

''ویری گڈ، بہت اچھا آئیڈیا ہے۔'' ان تینوں نے بھی جوش سے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور اِس طرح سب کی سمجھ آ جائے گا اور سب کچرا پھینکنے کی عادت ختم کر دیں گے؟'' نانو کو غصہ تو بہت آیا، مگر وہ ضبط کر کے بولیں۔

''مشکل ہے۔'' عفان نے منہ بنایا۔

''سب آگے ہی بھیجیں گے بس!'' یوسف سوچ کر بولا۔

''یا صرف لائیک ہی کریں گے۔'' علی نے بھی کہا۔

نانو نے ان چاروں کو غور سے دیکھا اور کچھ دیر سوچ کر بولیں:

''تم سب کا دل تو چاہتا ہے نا کہ پاکستان سب سے زیادہ خوب صورت ہو؟''

جواب میں چاروں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کیسے حاصل کیا تھا؟''

''بہت محنت اور جدوجہد سے۔'' یوسف بولا۔

''کیا محنت اور جدوجہد کی تھی؟'' نانو نے پھر پوچھا۔

''انھوں نے اور اُن کے ساتھیوں نے گھر گھر جا کر لوگوں کو بتایا تھا کہ پاکستان کیوں ضروری ہے۔'' احمد بولا۔

''اور جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے تقریریں کی تھیں۔'' علی نے جوش سے کہا۔

''بالکل ٹھیک!'' نانو نے شاباشی دی۔

''اور نانو! انگریزوں کو اچھی طرح سمجھایا کہ ہندو اور مسلمان، الگ الگ قوم ہیں، اس لیے دو الگ ملک بنیں گے۔'' عفان نے بھی اپنی قابلیت دکھائی۔

''شاباش، میرے بچو! آپ کو تو بہت ساری معلومات ہیں، لیکن اگر قائد اعظم کے پاس بھی موبائل ہوتا اور وہ صرف میسج آگے بھیجتے رہتے کہ انگریزو! ہمیں آزادی دو۔ انگریزو! ہمارا ملک چھوڑ دو، یا یہ کہ پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ الااللہ! اس میسج کو اِتنا پھیلاؤ کہ انگریز ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں تو کیا پاکستان بن جاتا!؟''

نانو کی بات سن کر سب کو ہنسی آ گئی۔

''ایسا کیسے ممکن تھا، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' احمد نے کہا۔

''تو پیارے بچو! اسی طرح صرف میسج کر دینے سے ملک صاف نہیں ہو سکتا، اس کے لیے عمل کر کے دکھانا ہوگا اور پوری کوشش کرنی ہوگی کہ آپ اور آپ کے دوست، سب مل کر اِدھر اُدھر کچرا پھینکنے کے بجائے کچرا دان میں ڈالیں اور لوگوں کو بھی یہ بات سمجھائیں، تاکہ سب ہی یہ کہیں کہ پاکستان کتنا پیارا اور خوب صورت ہے۔''

دادی کی بات سن کر اُن چاروں نے عہد کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے، کیوں کہ وہ جان گئے تھے کہ محض آرزوؤں سے تقدیر نہیں بدلتی۔

چار چاند

ڈاکٹر الماس روحی۔ کراچی

فضل دین ایک مالی تھا جو ایک بڑے سے باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ اسی باغ کے پاس ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ صبح سویرے جب بیمار لوگ باغ کی سیر کو آتے تو اُنھیں صحت مند ہوجانے کی دعا دیتا اور شام ڈھلے جب بچے اس باغ میں کھیلتے تو اُنھیں پکڑم پکڑائی، چھپن چھپائی کھیلتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔

ننھی ننھی چڑیاں جب اس کے لگائے ہوئے درختوں پر بیٹھ کر چوں چوں کرتیں تو وہ اپنے رب کا شکر اَدا کرتا، جس نے اسے پودے لگانے کا ہنر سکھایا۔ اس کے لگائے ہوئے رنگ برنگے پھولوں پر کبھی کوئی تتلی اس طرح آ بیٹھتی جیسے پھول نہ ہو، کرسی ہو۔ جیسے ہی بچے باغ میں آتے، اسے پھول پر بیٹھا دیکھ کر پکڑنا چاہتے اور وہ اپنے رنگ برنگے پروں کو پھیلا کر آناً فاناً اُڑ جاتی۔

کبھی وہ بارش میں اور کبھی چلچلاتی دھوپ میں کام کرتا اور جب تھک جاتا تو اپنے باغ کے گھنے درختوں کے نیچے پناہ لیتا۔ اس کے باغ کے درخت سایہ دار تھے، دھوپ سے سب کو بچاتے اور راحت وسکون پہنچاتے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سب کی ساری تھکن اتار دیتی تھیں۔

شہر کی اس سڑک پر اور بھی باغ تھے، لیکن فضل دین کا باغ زیادہ پُررونق اور تازہ پھولوں سے سجا تھا۔ اصل میں فضل دین کو اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ اپنا کام کو بہت محنت سے کرتا تھا۔ اس کی اسی محنت نے اس کے باغ کو چار چاند لگا دیے تھے۔

ایک دفعہ شہر میں پانی کی کمی ہوگئی۔ باغوں کے پودے سوکھنے لگے۔

گاؤں میں نہروں کے ذریعے پانی آتا ہے اور کھیتوں اور باغوں کو ہرا بھرا رکھتا ہے، لیکن شہروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں نلوں کے ذریعے پانی آتا ہے۔ کبھی کبھی کئی کئی دن لوگ پانی کو ترستے ہیں۔

فضل دین کو اپنے پودوں سے بہت محبت تھی۔ وہ اپنے باغ سے بہت دور جا کر اپنے کاندھوں پر پانی لاتا اور پودوں کو پانی دیتا۔ اس کے باغ کے سارے پودے ہرے بھرے رہتے۔ کچھ دن بعد اُس کے باغ کے درخت پھل دینے لگے۔ موسم کا ہر پھل اس کے باغ میں موجود تھا۔ گرمیوں میں وہ آم پک جانے پر جب درختوں سے آم اُتارتا تو باغ میں ہر آنے والے کو آم ضرور چکھاتا۔

علاقے کے بزرگ اس سے کہتے: ''بھئی فضل دین! آم تمھاری محبت سے بھری محنت کی وجہ سے میٹھا ہے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے باغ کے پھل علاقے میں مشہور ہوگئے۔ لوگ مول دے کر اُس کے پھل لے جاتے اور مزے مزے سے کھاتے۔ آہستہ آہستہ فضل دین نے دوسرا تیسرا باغ بھی خرید لیا اور اُن باغوں کو بھی اپنی محنت سے ہرا بھرا کر دیا۔

اس کے باغوں میں ہر طرف پھول ہی پھول کھلتے ہیں اور ہر پھل کی مٹھاس یہ بتاتی ہے کہ محنت ہی میں کامیابی ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی:

چار چاند: کسی چیز کو اور خوب صورت بنا دینا

پکڑم پکڑائی چھپن چھپائی: کھیلوں کے نام

چلچلاتی دھوپ: تیز دھوپ

سایہ دار: چھاؤں دینے والا

راحت وسکون: آرام

پُررونق: چہل پہل

بزرگ: بڑی عمر کے لوگ

ہدایت: راہ نمائی

مٹھاس: میٹھا ذائقہ

۷۔ مغیرہ بن سعید عجلی

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

گورنر خالد عبداللہ قسری کے پاس سے چلے جانے کے بعد مغیرہ نے مزید سوچ و بچار شروع کر دی۔ وہ شروع سے ہی دور کی سوچنے کا عادی تھا، اسی لیے تو اُس نے پہلے اپنی آزادی کے متعلق سوچا اور پھر اُس نے خود کو دھوکے سے امام ثابت کیا۔ امام بن کر اُس نے دیکھا کہ دنیا میں جاہل اور بے وقوف لوگ موجود ہیں۔ ان بے وقوفوں نے امامت کے رتبے پر فائز ہونے کے بعد اُس کو بہت عیاشی کروائی تھی۔ مغیرہ اپنی عیاشی میں مزید اضافہ کرنا چاہتا تھا، اس نے سوچ بچار کے بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

جاہلوں نے اس کی اس غلیظ بات پر بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس کی جعلی نبوت پر ایمان لا کر اپنی دنیا و آخرت برباد کر بیٹھے۔ اب مغیرہ کی عیاشی دوبالا ہو چکی تھی۔ اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔

جب مغیرہ بن سعید عجلی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تو شیطان نے اسے ایک اور پٹی پڑھائی۔ اس نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر وحی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش گوئیاں کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پوری ہوتی تھیں، سو اُسے بھی کچھ پیش گوئیاں کرنی چاہییں۔

مغیرہ نے سوچ و بچار شروع کی اور حالات و واقعات کو دیکھا۔ حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ کا اصل نام محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم تھا۔ گویا وہ سید زادے تھے اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے تھے۔

مغیرہ بن سعید عجلی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن رکھی تھی، جس میں حضرت امام مہدی کی آمد کا ذکر ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”اللہ تعالیٰ میری نسل سے ایک آدمی کو بھیجے گا، جس کا نام میرے نام پر ہوگا اور اُس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔“

(مسند امام احمد: 377/1،430، سنن ابوداود: 4282، سنن الترمذی: 2230)

مغیرہ نے جب دیکھا کہ حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں اور اُن کا نام اور اُن کے والد کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے والد کے نام پر ہے تو اُس نے جھوٹ گھڑ لیا اور پیش گوئی کی:

”حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ ہی اصل میں وہ مہدی ہیں جن کی آمد کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔“

مغیرہ کا اس پیش گوئی کو کرنا تھا کہ اس کے عقیدت مند اَب حضرت نفس ذکیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اردگرد بھی منڈلانے لگے۔ ان کی سیاسی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ خلیفہ وقت نے جب ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے تحقیق کی تو اُسے معلوم ہوا کہ سیاسی معاملے سے زیادہ حساس معاملہ پیدا ہو گیا ہے، یعنی مغیرہ بن سعید عجلی کے جھوٹے دعویٰ نبوت کی وجہ سے لوگوں کا ایمان خطرے میں پڑ گیا ہے تو اُس نے فوراً گورنر خالد عبداللہ قسری کو حکم بھجوایا:

”مغیرہ بن سعید عجلی کے فتنے کا فوراً خاتمہ کیا جائے۔“

یہ اطلاع گورنر خالد عبداللہ قسری سے پہلے مغیرہ بن سعید عجلی کو اُس کے جاسوسوں نے دے دی۔ انھی جاسوسوں کے ذریعے تو وہ اپنے اردگرد ہونے والے حادثات کی خبریں حاصل کرتا تھا اور پھر اُن حادثات سے متاثر لوگوں کو اپنے پاس بلوا کر کرامت اور معجزے کے طور پر اُن کے ساتھ بیتے واقعے کو بیان کرتا اور انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا کرتا تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر 44 پر

شگفتہ پارے

قارئین

☆ شاہد (سلمان سے):
"آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ہر چیز مجھے دو دو، دِکھائی دے رہی ہے۔"
سلمان (ہزار روپے کا ایک نوٹ دیتے ہوئے):
"یہ لو دو ہزار روپے، جو میں نے تم سے ادھار لیے تھے۔"

(لبابہ بنت عبدالمنان۔ کراچی)

☆ دو آدمیوں نے کشتی کرائے پر لی اور دریا پار کرنے لگے۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی تو ایک نے گھبرا کر کہا:
"اُف! کتنی تیز ہوا چل رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طوفان آجائے اور کشتی ڈوب جائے۔"
دوسرا: "اچھا ہے، ڈوب جائے۔ کشتی والے نے کرائے کے پیسے بھی زیادہ لیے ہیں۔"

(حمزہ بن محمد طلحہ۔ کراچی)

☆ ایک بے وقوف دوسرے بے وقوف سے:
"انور! تم گائے سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟
ساجد: "بات یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ اگر گائے نے بھوسا کھانا شروع کر دیا تو میرا کیا ہوگا؟"

(شایان بن سلمان احمد)

☆ گاہک (درزی سے): "میرے سوٹ میں کتنا کپڑا لگے گا؟"
درزی: "چھے میٹر۔"
گاہک: "برابر والا درزی تو ساڑھے پانچ میٹر کہہ رہا ہے۔"
درزی: "جناب! اس کا لڑکا ایک سال کا ہے، جب کہ میرا تین سال کا ہے۔"

(محمد عزیر بن محمد اعجاز۔ حیدرآباد)

☆ ایک بوڑھا (ڈاکٹر سے):
"جناب! مجھے کوئی ایسی دوا دیں کہ مرض ایک دم ختم ہوجائے۔"
ڈاکٹر: "آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو ایسی دوا دوں گا کہ آپ جوان ہوجائیں گے۔"
بوڑھا (گھبرا کر): "نہ، نہ، ڈاکٹر صاحب! ایسا نہ کریں، ورنہ میری پینشن بند ہوجائے گی۔"

(ناہید۔ ٹھٹھہ)

☆ ایک صاحب پہلی بار لاہور آئے۔ وہ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک دکان پر ایک خوب صورت ٹوکری دیکھی، جو انھیں بہت پسند آئی۔ ان صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ لاہور کے دکان دار ہر چیز کی دگنی قیمت بتاتے ہیں اور آدھی قیمت پر دے دیتے ہیں۔ انھوں نے دکان دار سے قیمت پوچھی۔
اس نے کہا: "دو سو روپے۔"
وہ صاحب فوراً بولے: "۱۰۰ روپے دوں گا۔"
دکان دار: "صاحب جی! یہ تو بہت کم ہیں، ۱۵۰ روپے دے دیں۔"
وہ صاحب: "۷۵ روپے دوں گا۔"
دکان دار: "۱۰۰ روپے کی تو میں نے خریدی ہے۔ اچھا چلیں، آپ ۱۰۰ ہی دے دیں۔"
وہ صاحب: "۵۰ روپے دوں گا۔"
دکان دار (تنگ آکر): "آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ سے کیا پیسے لوں، آپ مفت لے لیں۔"
اس پر اُن صاحب نے کچھ دیر سوچا، پھر بولے:
"میں تو ۲ لوں گا۔"

(سارہ بنت محمد یوسف مرحوم۔ سکھر)

☆ کسی رسالے کے مدیر صاحب ایک مرتبہ نہر میں گر پڑے۔ ایک شخص نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے انھیں نہر سے نکالا۔
مدیر صاحب اس شخص کے بہت ممنون تھا۔ انھوں نے اس شخص کو بتایا کہ میں ایک رسالے کا ایڈیٹر ہوں، اگر میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں تو بتایئے۔"
اس آدمی نے بستے سے ایک کاغذ نکالا اور اُنھیں دیتے ہوئے کہا:
"یہ میری کہانی ہے، اسے چھاپ دیں۔"
مدیر صاحب کہانی دیکھ کر بولے: "اس سے بہتر ہے بھائی! تم مجھے نہر میں واپس پھینک دو۔"

(وحید گل۔ کوئٹہ)

جذبۂ ایثار

روبینہ عبدالقدیر۔ کراچی

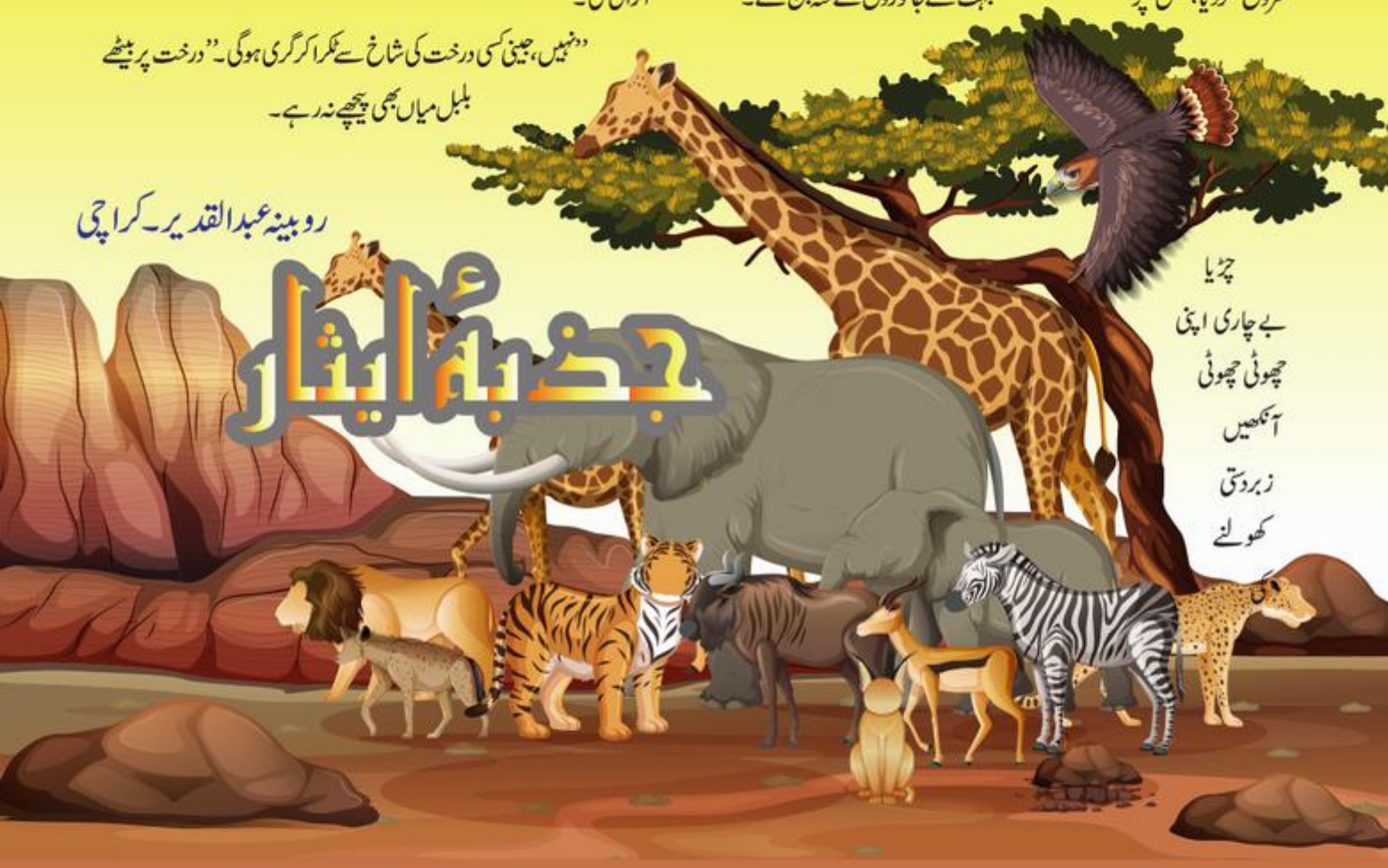

''اوہ ہو! جلدی سے کوئی ڈاکٹر گوشا کو بلاؤ، پتا نہیں جینی چڑیا کو کیا ہوا ہے؟''

بی فاختہ اور کوئل اپنی سریلی، مگر تیز آواز سے شور مچا رہی تھیں۔ ان کے گھیرے میں زمین پر ایک سنہرے رنگ کی خوب صورت چڑیا زخمی پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ جانوروں کا رَش بڑھنے لگا۔

''ہٹو، ہٹو، مجھے دیکھنے دو!''

ہمیشہ کی طرح بڑی اماں بننے کی شوقین بی لومڑی نے آگے بڑھ کر سب کو ہٹانا شروع کر دیا، جس پر بہت سے جانوروں کے منہ بن گئے۔

چڑیا بے چاری اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں زبردستی کھولنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کے سنہرے پَر سرخ خون میں رنگتے جا رہے تھے۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزوری بھی محسوس کر رہی تھی۔

جنگل کی تیمار دار انتظامیہ کے کارکن بھالو میاں اور مسکو چوہے نے چڑیا کو آرام سے اٹھا کر کھجور اور پتوں کے بنے بستر پر لٹایا۔ یہ بستر خاص طور پر مریضوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بھالو میاں نے چھوٹے سے کٹورے میں پانی بھر کر چڑیا کو پلانے کی کوشش کی۔ پانی کے چند قطرے بمشکل چڑیا کے حلق تک گئے تھے کہ ڈاکٹر کی آمد کا شور مچ گیا۔

''جینی کا زخم بہت گہرا ہے، اس کا خون بہت ضائع ہوا ہے۔''

گوشا ڈاکٹر اپنی ناک پر موٹے شیشوں کا چشمہ جمائے چڑیا کا معاینہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر گوشا کا شمار ماہر ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک سفید رنگ کے موٹے تازے خرگوش تھے۔ لمبے لمبے کانوں کی مدد سے بڑا سا چشمہ چھوٹی سی ناک پر ٹکا کر ہر جگہ علاج کرنے بروقت پہنچ جایا کرتے تھے۔

''ضرور جینی کو کسی نے دھکا دیا ہوگا۔'' بی لومڑی نے نتھنے پھلا کر فوراً قیاس آرائی کی۔

''نہیں، جینی کسی درخت کی شاخ سے ٹکرا کر گری ہوگی۔'' درخت پر بیٹھے بلبل میاں بھی پیچھے نہ رہے۔

بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔

''جینی چڑیا کو خون کی سخت ضرورت ہے، کون دے گا اپنا خون؟''

چڑیا کی مرہم پٹی کرتے ہوئے گوشا ڈاکٹر نے جوں ہی خون کی بات کی سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''کیا کوئی بھی جینی کی مدد نہیں کرے گا؟'' گوشا ڈاکٹر افسوس سے بولے۔

''معاف کرنا بھیا! میں تو خود کمزور جان ہوں۔ ہڈیوں میں شکار کرنے

کا بھی دم خم نہیں رہا۔''

سب سے پہلے بی لومڑی اٹھیں اور اپنے گھر کی جانب چل دیں۔ ان کے جاتے ہی جانوروں کا جم گھٹا کم ہونے لگا۔ جینی چڑیا کمزوری سے بند ہوتی آنکھوں سے جانوروں کو اُسے اکیلا چھوڑتا جاتے دیکھنے لگی۔

لیکن چند ہی لمحوں بعد چڑیا کے گھر والے، جنھیں خبر مل گئی تھی، سب چڑیا کی مدد کے لیے آ پہنچے۔

ننھی ننھی چڑیوں نے اپنی بہن جینی چڑیا کے لیے خون عطیہ کیا۔ ڈاکٹر گوشا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لیکن جنگل کے باقی جانوروں کا رویہ دیکھ کر اندر ہی اندر بہت دکھی بھی تھے۔

موسم گرما اپنے جوبن پر تھا۔ گرمی کی شدت سے جنگل کے پانی والا کنواں بھی خشک ہونے کے قریب تھا۔ خوراک کے ذخائر بھی ختم ہونے والے تھے۔ سب جانور آنے والے دنوں کا سوچ کر بہت پریشان تھے۔

جنگل کے سیانے اور بزرگ جانوروں کی مشاورت سے ایک میٹنگ رکھی گئی۔ جنگل کے بادشاہ شیر بھی اس میں شامل تھے۔

''بادشاہ سلامت! اس وقت جنگل قحط سالی کے بالکل قریب ہے۔ پانی اور خوراک کا ذخیرہ بس چند دِن کا ہی باقی ہے۔ اس وجہ سے بہت سے گھرانے فاقہ کشی کا شکار ہو سکتے ہیں۔''

گیدڑ نے مشیر کی ذمے داری ادا کرتے ہوئے رپورٹ پیش کی۔

''آپ میں سے کسی کے پاس قحط کے موقع پر پریشانی سے بچنے کا کوئی حل ہے؟'' بادشاہ سلامت نے سب کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمیں خوارک کو برسات کے موسم تک کم سے کم استعمال کرنا ہوگا، پھر ہم شاید پریشانی سے بچ سکیں۔'' چیتے نے اپنی رائے پیش کی۔

''لیکن بال بچوں والے جانور کیسے کم استعمال کریں؟ میرے بٹو اور شکو کو ہر دس منٹ بعد بھوک لگتی ہے۔'' بکری خالہ نے اپنے چھوٹے چھوٹے جڑواں بچوں کو ساتھ لپٹاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''میری رائے ہے کہ سب جانور اپنے گھروں میں ذخیرہ کی گئی خوراک بھی جنگل کے گودام میں جمع کروائیں، پھر سب کو برابر خوراک ملے گی اور برسات تک سب جانور گزارا کر لیں گے۔'' نرم دل گوشا ڈاکٹر نے معقول مشورہ دیا۔

لیکن سب جانور اُن کی بات پر پہلو بدل کر رہ گئے، جسے شیر سمیت گوشا ڈاکٹر نے بھی اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

''نہیں بھئی، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔'' بی لومڑی نے اپنی ہم شکل بہنوں کے ساتھ مل کر فوراً اس بات کو رَد کیا۔

یوں بغیر کسی متفقہ فیصلے کے یہ مجلس برخاست کر دی گئی۔

چند دِن بعد گودام میں موجود خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ جنگل کے غریب جانور مر رہے تھے، لیکن کوئی آگے بڑھ کر کسی کی مدد نہیں کر رہا تھا۔

''یا اللہ! یہاں کے جانوروں کے دلوں میں تو رحم نہیں، تُو ہی ہم پر رحم کر دے۔''

معصوم ہرنی روتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے فریاد کر رہی تھی۔ آج تیسرا دن تھا، ان کے گھر خوراک کے علاوہ پانی بھی بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ہرنی کے تین ننھے بچے فاقے کی وجہ سے نیم مردہ حالت میں تھے۔ بچوں کی حالت دیکھ کر ہرنی نے کتنے ہی جانوروں سے مدد مانگی تھی، لیکن سب نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا تھا۔

''کیا ہوا ہرنی خالہ! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟'' فضا میں اڑتی چڑیا نے اداس ہرنی سے پوچھا۔

وجہ جاننے کے بعد چڑیا بھی فوراً اُڑ گئی۔ ہرنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے جنگل کے جانوروں کا جینی چڑیا کے ساتھ کیا گیا سلوک یاد آنے لگا۔

وہ اپنے گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ کر اپنے بچوں کو دیکھنے لگی، جو بھوک اور پیاس سے بلبلا رہے تھے۔

کہیں سے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

بی بکری کے گھر بھی سوگ کا سماں تھا۔ شکو بھوک برداشت نہ کرتے ہوئے آج مر گیا تھا۔

سفید رنگ کے خوب صورت شکو کی لاش سامنے رکھے بی بکری زور زور سے رو رہی تھی۔ بٹو بھی ماں کے ساتھ بیٹھا بھائی کو دیکھ کر بلند آواز سے رو رہا تھا۔

جنگل میں جانوروں کی موت معمول بن چکی تھی۔ دائیں جانب موجود قبرستان جانوروں کی قبروں سے بھرنے لگا تھا۔

بٹو اور بی بکری بھی روتے روتے بے ہوش ہو گئے تھے۔ گوشا ڈاکٹر نے تیماردار اِنتظامیہ کے ساتھ مل کر شکو کے کفن دفن کا انتظام کیا اور اِس مسئلے کا حل سوچنے لگے۔

برگد کے پیڑ تلے اس وقت سب موجود تھے۔ جانوروں کی کثیر تعداد مرنے کے بعد اَب باقی جانور بہت نڈھال اور حالات سے خوف زدہ دکھائی دے رہی تھے۔

گوشا ڈاکٹر نے شیر کی اجازت سے بولنا شروع کیا:

''میرے پاس قحط سالی کے مسئلے کا ایک حل موجود ہے۔''

''وہ کیا؟'' سب بیک زبان بولے۔

''وہ یہ کہ سب جانور وعدہ کریں کہ وہ اپنے پاس موجود خوراک اور پانی سے دوسرے جانوروں کی مدد کریں گے۔''

جانور آمادہ نظر آنے لگے۔

''اور سب اپنے پچھلے رویے پر اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگیں۔ جب تک ہم ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ بھی ہماری مدد نہیں کرے گا۔''

بادشاہ سلامت شیر نے بھی سب کو سمجھایا۔

اب جانور اپنے پچھلے رویے پر بھی شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

''میں اپنے پاس موجود سارا پانی جنگل کے جانوروں کے لیے وقف کرتی ہوں۔''

بلی بنو نے اپنے پاس بچا ہوا تھوڑا سا پانی پیش کرتے ہوئے اس نیک عمل کی ابتدا کر دی۔

چوہے، مرغی، ہرنی اور دیگر جانور بھی اپنے گھروں سے بچا کھچا خوراک کا سامان لانے لگے۔

خود سے چھوٹے جانوروں کا جذبہ ایثار دیکھتے ہوئے بی لومڑی کو دل ہی دل میں شرمندگی محسوس ہونے لگی۔''

''میں تو سب سے زیادہ سمجھ دار اور ہوش یار سمجھی جاتی ہوں، پھر میں نے پہل کیوں نہ کی؟''

دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے وہ اپنے گھر کی جانب بڑھ گئیں، جہاں کئی دنوں کی خوراک کا ذخیرہ موجود تھا۔

کچھ ہی دیر میں جنگل کا گودام خوراک اور پانی سے بھر گیا تھا، جس میں سے ضرورت مندوں کی مدد کی جا رہی تھی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد سب جانور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جینی چڑیا اپنے پورے خاندان سمیت، جمع کیا ہوا دانہ چونچوں میں دبائے جانوروں کی امداد کے لیے آ پہنچی تھی۔

''جینی چڑیا نے ثابت کر دیا ہے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیے۔''

ڈاکٹر گوشا نے مسکراتے ہوئے جینی کی تعریف کی۔ سب کے چہروں پر خوشیوں بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

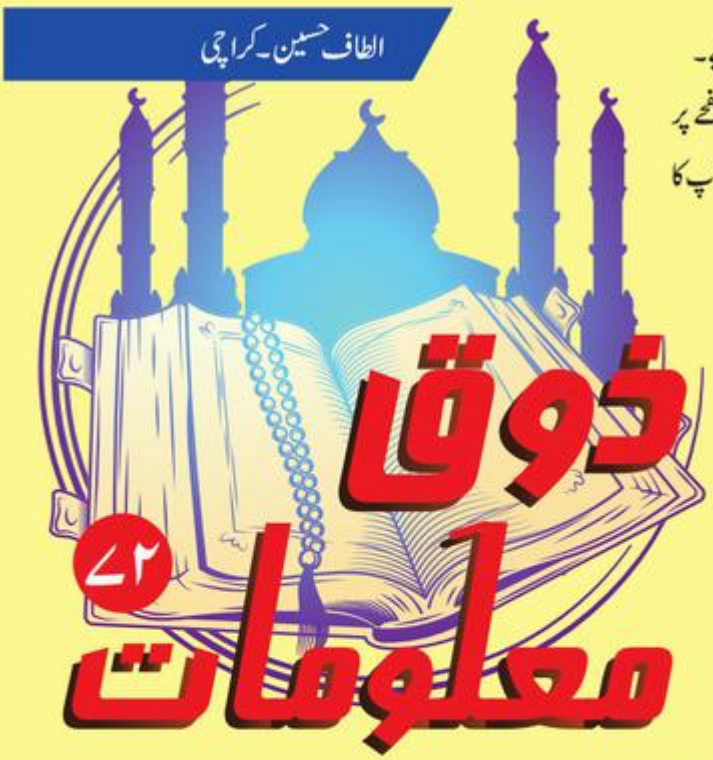

الطاف حسین۔ کراچی

یہ گل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔ آپ کا جواب ۳۱، جنوری تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کون ہیں؟

1. آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تھے۔ (رسول انھیں کہتے ہیں جن پر کتاب بھی نازل کی گئی ہو)۔
2. آپ علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔
3. آپ علیہ السلام کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوخانذ تھا۔
4. سفر معراج کے دوران میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹے آسمان پر آپ علیہ السلام سے ملاقات کی تھی۔
5. قرآن مجید میں آپ علیہ السلام کا ذکر سب سے زیادہ (۳۴) سورتوں میں موجود ہے۔

محترم ادیب سمیع مرحوم چمن کی ماہ نامہ ''ذوق وشوق'' کے لیے بھیجی گئی ایک پرانی کہانی۔

ہماری حجامت

ادیب سمیع چمن مرحوم۔ حیدرآباد

لو بھئی بچو! آج بچپن کا ایک مزے دار دل چسپ قصہ یاد آ گیا۔

سن ۷۲ء میں میری عمر تقریباً بارہ برس ہوگی۔ اس وقت میں پانچویں کلاس کا کھلنڈرا سا طالب علم ہوتا تھا۔ شرارتیں تو میری نس نس میں بھری ہوئی تھیں اور شرارتیں ایسی کہ جو پڑھے یا سنے تو آج بھی روتا ہوا ہنسنے لگے۔

تو جناب! ہمارے محلے میں روزانہ ایک بوڑھا حجام، جس کے ایک ہاتھ میں ٹین کی بنی ہوئی چھوٹی سی صندوقچی، جس میں حجام میاں کی بال کاٹنے کی بہت سی چیزیں مثلاً قینچیاں اور میلے کچیلے سے کنگھے رکھے ہوتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھری چھوٹی سی کیتلی نما بالٹی ہوا کرتی تھی، آوازیں لگاتا ہوا آیا کرتا تھا۔

مجھے یہ بوڑھا حجام بالکل پسند نہیں تھا اور میں اس سے بال کٹوانا بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے بال وال کاٹنے کیا آتے تھے۔ یوں کہہ لو کہ کسی کے دنبہ کٹ، کسی کے بلی کٹ اور کسی کے بکرا کٹ بال کاٹا کرتا تھا۔

محلے کے پرانے بزرگوں سے اس کی خوب گھٹتی تھی۔ جہاں یہ بیٹھتا کسی کے بال کاٹنے، بزرگ حضرات، کچھ ڈنڈا ٹیکتے، کچھ کھانستے اس کے پاس جمع ہوجاتے تھے۔ خوب گھٹتی تھی۔ پرانے قصے، اپنی اپنی جوانی کی داستانیں ان کے موضوع ہوا کرتے تھے۔

ہمارے گھر میں بھی ان پرانے، ہٹلر کے زمانے کے حجام بابا کا پابندی سے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ابا جان کے بال اور داڑھی کی حجامت کرنے کا اعزاز یہی ہندوستان سے رکھتے چلے آ رہے تھے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اُس وقت حجام بابا ستر، بہتر سال کے تو ضرور ہوں گے۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں والا بھدے سے فریم والا چشمہ لگا کر ایسے مشین چلاتے جیسے باغوں میں مالی گھاس کاٹنے والی مشین دھکیل کر چلاتے ہیں۔ بال کاٹتے وقت باتیں زیادہ اور کام کم کیا کرتے تھے اور سر پر بندر روڈ، جمشید روڈ اور لانڈھی کورنگی کی سڑکوں کے نقشے منٹوں میں بنا دیا کرتے تھے اور پھر کمال فن کے ساتھ ایک چھوٹا سا آئینہ حجامت کروانے والے کے ہاتھوں میں تھما کر خود کٹے بال اور کپڑا زور زور سے پٹخ پٹخ کر کے جھاڑنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ بال کٹوانے والا اپنے آپ کو خوب صورت ہیرو کی طرح دیکھتا اور اِدھر اُدھر چہرہ گھما کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔

میں تو اِس حجام سے بال کٹوانا بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ جیسے ہی مجھے معلوم ہوتا کہ آج بابا حجام بچوں کے بال کاٹنے آ رہے ہیں تو میں ان کے آنے سے پہلے ہی گھر سے اُڑن چھو ہوجایا کرتا۔ ابا دیگر بچوں کو میری تلاش میں دوسرے گھروں میں ڈھونڈنے کے لیے جب بھی دوڑایا کرتے تھے بے چارے بچے ناکام ہی واپس آیا کرتے تھے۔ مجھے تو محلے کی بڑی اور شیشوں کے دروازے والی دکان سے بال کٹوانا پسند تھا۔

اب سنو، ایک دفعہ ہوا یوں کہ میں نے اسکول سے آ کر جیسے ہی ہاتھ منہ دھویا ویسے ہی یہ حجام بابا، ابا کو آواز دے کر گھر میں داخل ہوگئے۔ ابا نے کیا یہ کہ سب سے پہلے دروازے کی کنڈی لگوادی اور دوسرے بچوں کی حجامت شروع ہوگئی۔ جب میرا نمبر آیا تو میں حسب عادت اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں امی کے پیچھے چھپ گیا، جو بڑی بے فکری سے مشین پر کپڑے سی رہی تھیں، مگر آج میری کوشش ناکام ہوگئی۔ جیسا ہی چھاپا پڑا میں فوراً پکڑا گیا۔ میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ میں روتے پیٹتے ہوتے چیخنے لگا:

''نہیں کٹواؤں گا میں بال، ان چاچا کو بال نہیں کاٹنے آتے۔ یہ اپنے بال دوسروں سے کٹواتے ہیں اور ہمارے خود کاٹنے آجاتے ہیں۔''

مگر آج میری فریاد، چیخ و پکار، سب رائیگاں چلی گئیں۔ ابا مجھے کھینچتے ہوتے حجام بابا کے سامنے لے آئے۔ میں روتے ہوئے پھر چیخا:

''نہیں کٹواؤں گا حجام چاچا! تم سے بال۔ مجھے تم سے بندر روڈ، کورنگی روڈ بال نہیں کٹوانے۔''

''ارے! تم دیکھنا تو سہی، ایسے شان دار ہیرو کٹ بال کاٹوں گا کہ سب حیران رہ جائیں گے۔''

حجام صاحب کپڑا بچھا کر زمین پر ہی بال کاٹتے تھے۔ میری گردن سے میلا کچیلا سا کپڑا لپیٹ کر مجھے بٹھا لیا اور مشین چلانا شروع کر دی اور مجھے بادشاہ جن کی کہانی سنانا شروع کر دی۔

دوسرے بچوں کی طرح بچپن مجھے بھی بادشاہ جن اور پریوں کی کہانیاں بہت پسند آتی تھیں۔ حجام بابا کو میری کم زوری کسی نے گھر میں بتا دی تھی۔ میرا دھیان بالوں سے ہٹ کر اُن کی کہانی کی طرف ہو گیا۔

اب مجھے کیا خبر تھی کہ حجام میاں مجھے قصے کہانیوں میں لگا کر میرا سر گنجا کرنے میں مصروف ہیں۔

وہ بڑی چالاکی کے ساتھ میرے سر کے بالوں کو میرے آگے بندھے میلے کچیلے کپڑے میں ڈالنے کے بجائے اپنے آگے رکھے کپڑے میں ڈال رہے تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا، اچانک انھیں کھانسی آئی اور بے خیالی میں ہاتھ چوک گیا اور بالوں کو میرے آگے پھینک دیا۔

میں یک دم چونک پڑا:

''ہیں ں ں...... یہ بالوں کا گچھا!؟''

میں نے گھبراتے ہوئے جلدی سے اپنے سر پر جو ہاتھ پھیرا تو میرا آدھا سر بالوں سے خالی ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس ظلم اور دھوکے پر جو مجھے غصہ آیا تو میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جلدی سے اٹھ کر حجام بابا کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ ان کا سر نیچے زمین پر لگا۔ ہاتھوں سے مشین چھوڑ کر دُور جا گری اور ٹانگیں اونچی ہو کر وہ دھڑام سے زمین پر قلابازی کھا چکے تھے۔ وہ چیخے:

''ہائے میں مر گیا، ارے مر گیا! ہائے میری کمر ٹوٹ گئی۔ ابے جن کی اولاد! میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

دوسری طرف ابا جان ہمیں حجام صاحب کی تحویل میں دے کر بیٹھے ہی تھے کہ اچانک ان کا کوئی واقف کار آ گیا تھا اور وہ جا چکے تھے۔

حجام صاحب کی چیخ و پکار اور ہائے ہائے کا شور سن کر گھر والے تو گھر والے، محلے کے بچے بڑے، بڑی بوڑھیاں اس طرح گھر میں دھکم پیل کرتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے تھے جیسے یہاں لنگر تقسیم کیا جا رہا ہو۔

حجام صاحب کو لوگ اُٹھاتے تھے، مگر حجام صاحب ''ہائے میں مر گیا، ہائے میں مر گیا!'' کا نعرہ لگاتے ہوئے پھر واپس لڑھک جاتے تھے۔

اتنے میں ابا جان بھی آ گئے۔ وہ ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگے، پھر تیزی سے حجام میاں کو اُٹھایا اور چار پائی پر لٹا دیا۔ ان کی کمر کی مالش کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا ماجرا ہے؟''

وہ کیا کہتے، لیکن محلے کے بچے کورس کے انداز میں میری شکایت کی ''کمنٹری'' شروع کر چکے تھے۔ ابا جان نے روح افزا کا ٹھنڈا شربت پلوایا اور پانچ روپے دیے تو حجام میاں خوش ہو گئے۔

(ان دنوں ایک روپے کی پانچ روٹیاں آ جاتی تھیں۔)

حجام چاچا بڑبڑاتے چلے گئے۔

ادھر میرا حال سنیے۔

میں جیسا ہی گھر سے بھاگتا ہوا باہر نکلا، عجب مشکل میں پھنس گیا۔ جدھر جاؤں بچے تالیاں بجا کر، قہقہے لگا کر میرا استقبال کر رہے تھے۔ میری آدھی کھوپڑی پر بال اور آدھی چندیا صاف! جدھر جاؤں ایک تماشا بن رہا تھا۔ ابا جان اور ماموں جان مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ بچوں نے انھیں میرا پتا بتا دیا۔ یہ محلے کے جاسوس بچے تھے۔ یوں مجھے پکڑ کر گھر لایا گیا۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ آنسو تھمتے نہ تھے۔

حجام بابا پھر آ گئے تھے اور آنگن میں آرام دہ کرسی پر بڑے مزے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ پانچ روپے لے کر اور شربت پی کر اُن کی ٹوٹی کمر بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔

اب حجام بابا نے میرا بقایا سر گنجا کر دیا۔ مجھے اپنے خوب صورت بالوں کے کٹنے پر شدید غصہ تھا۔ میں نے ابا جان کے ہوتے ہوئے بھی حجام بابا کو دھمکی دیتے ہوئے کہا:

''حجام بابا! میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں!''

یہ سن کر ابا جان نے میرے گال پر تمانچے کا جو ''پیار'' کیا وہ آج تک بھولا نہیں ہوں۔ اس پیار کے نتیجے میں دن میں تارے تو تارے، چاند بھی نظر آ گیا تھا۔

میں نے گنجے سر پر ٹوپی پہن کر وقت گزارا۔ جب تک سر پر بال نہیں آئے سر کو ڈھانپے رہا۔ پورے ڈیڑھ دو ماہ میں حجام بابا کو ڈھونڈتا رہا، مگر وہ اس کے بعد کبھی نظر نہیں آئے۔

پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے؟

آج بھی یہ قصہ بھولا نہیں ہوں۔

اب کیا کیا جائے؟

اس وقت عقل ہی کہاں تھی!

اجوائن

سعد علی چھیپا۔ کراچی

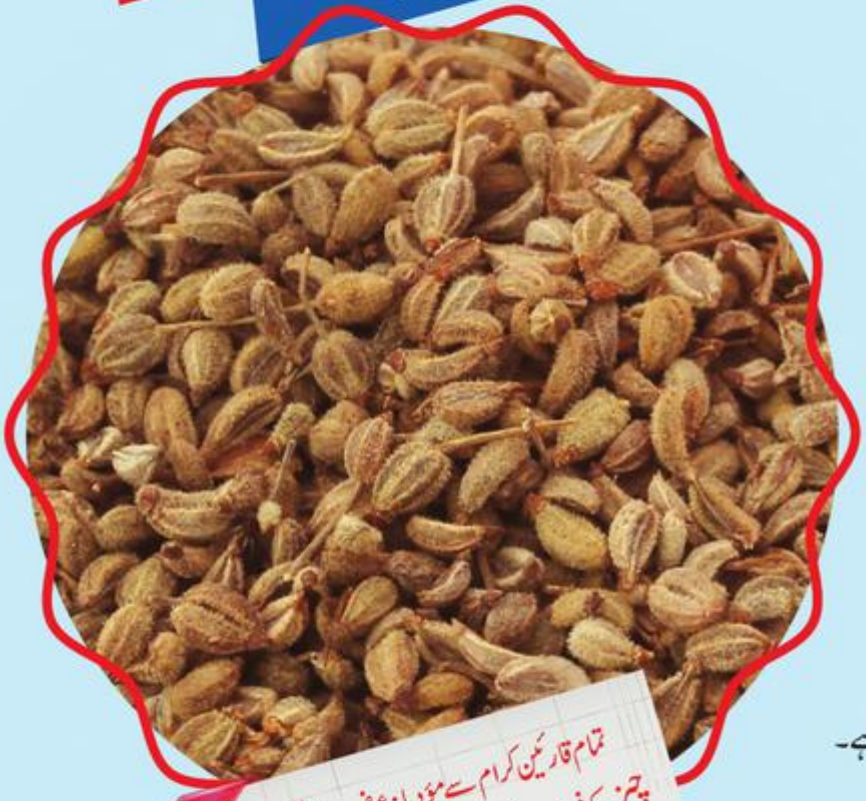

گرم مسالے میں شمار کی جانے والی اجوائن کے استعمال کے بے شمار فوائد ہیں۔ اسے نہ صرف کھانوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، بل کہ اس کا قہوہ بھی بنا کر پیا جاسکتا ہے۔

صدیوں سے استعمال کی جانے والی اجوائن مجموعی صحت پر مثبت طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اسے قدرتی اینٹی آکسیڈنٹ بھی کہا جاتا ہے۔ نہار منہ اس کے قہوے کے استعمال سے وزن میں کمی سمیت جلد صاف ہوتی ہے اور جسم سے مضر صحت مادوں کا صفایا بھی ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں کئی وائرل بیماروں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔ ماہرین غذائیت کا کہنا ہے کہ چھوٹے بیجوں کی شکل میں یہ صحت کے لیے ایک بھرپور خزانہ ہے۔

اجوائن کے فوائد:

☆ اجوائن ہاضمہ تیز کرتی ہے اور بھوک بڑھاتی ہے۔

☆ بلغم اور ریاح کو ختم کرتی ہے۔

☆ پیچش میں مفید ہے۔

☆ پیٹ کے کیڑوں کو ختم کرتی ہے۔

☆ رگوں کے سدے کھولتی ہے۔

☆ جگر کی سختی کو دور کرتی ہے۔

☆ گردے اور مثانے کی پتھری کو توڑتی ہے۔

☆ فالج اور لقوہ میں مفید ہے۔

☆ ہچکی کو دور کرتی ہے۔

☆ دمہ میں بھی فائدہ مند ہے۔

☆ فالج اور اعصابی کم زوری والے مریضوں کے لیے مجرب ہے۔

☆ اجوائن کے چند دانے چبا لینے سے قے فوراً رک جاتی ہے۔

☆ اگر منہ کا ذائقہ خراب ہو تو اجوائن کے دانے چبانے سے ٹھیک ہوجاتا ہے۔

☆ دل کو طاقت دیتی ہے اور اعصابی دردوں کے لیے مفید ہے۔

☆ بھڑ یا بچھو کے کاٹنے کی صورت میں اگر فوری طور پر متاثرہ جگہ پر اجوائن کا لیپ کیا جائے تو فوراً آرام آجاتا ہے۔

☆ اجوائن کو اگر شہد کے ہم راہ کھایا جائے تو چہرے اور ہاتھ پاؤں کی سوجن میں فائدہ دیتی ہے۔

☆ کالی کھانسی میں بھی مفید ہے۔

☆ اس کا روزانہ کا استعمال بدن میں چستی لاتا ہے۔

☆ پرانے بخار میں اجوائن استعمال کرنے سے چند دِن کے اندر بخار دور ہوجاتا ہے۔

☆ اجوائن کے کھانے سے کھٹی ڈکاریں آنا بند ہوجاتی ہیں۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی چیز کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرکے کوئی بھی غذا استعمال کریں۔

اندھیروں کا لشکر

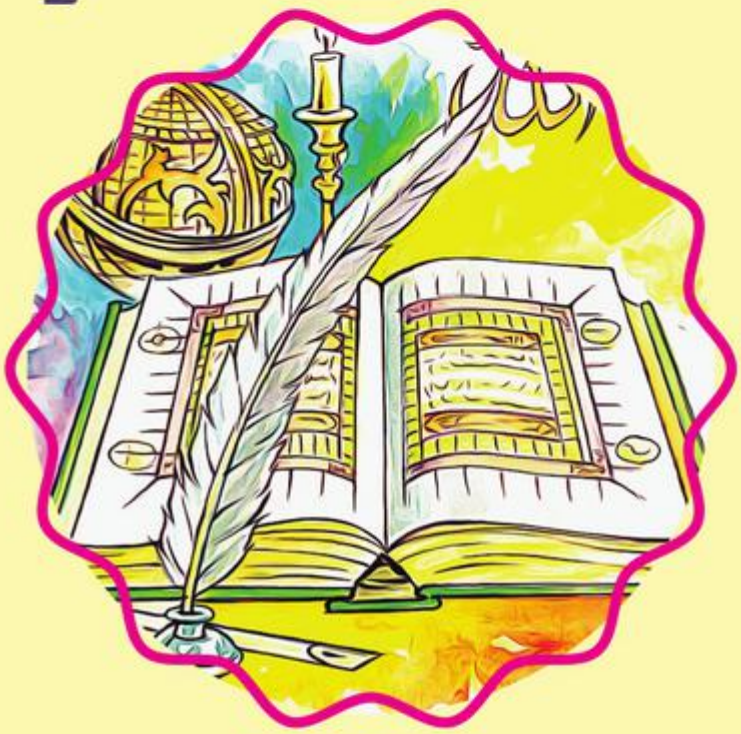

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

"اناطولیہ" (یعنی تقریباً موجودہ ترکی) کی ایک اہم ترین ریاست "سلاجقۂ روم" بھی گزری ہے، جس کا مرکز "قونیہ" تھا۔ یہ سلطنت، بازنطینی رومن بادشاہت کے ان علاقوں پر مشتمل تھی جو خلفائے راشدین، بنواُمیہ اور بنوعباس کے دور میں فتح کیے گئے تھے۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط، یعنی ۴۵۰ھ کے قریب یہ علاقے سلجوقی خاندان نے فتح کر لیے تھے۔ صرف کچھ مغربی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ عثمانی ترکوں کی حکومت بھی سلجوقی سلطنت کی نیابت میں ہی قائم ہوئی تھی۔ سلاجقۂ روم ۲۳۸ سال تک چلی، ۴۶۹ھ سے لے ۷۰۷ھ تک۔

سلجوقی سلطنت کے ایک سلطان کا نام تھا سلطان الپ ارسلان۔ اس کا ایک وزیر تھا، جس کا نام تھا: نظام الملک ابوالحسن بن علی طوسی، جسے خواجہ بزرگ کہا جاتا تھا۔ یہ انتہائی نیک، متقی، پرہیزگار اور عابد و زاہد اِنسان تھا۔ علم اور علما سے محبت رکھنے والا تھا اور اُن کی قدر کرتا تھا، نیز رعایا کے ساتھ بھی بہت ہمدرد اور اُن کا خیال رکھتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ امورِ سلطنت میں بھی خاصا تجربہ اور مہارت رکھتا تھا، جس کی وجہ سے مملکت کو اُس کے دور میں بہت استحکام حاصل ہوا۔

الپ ارسلان کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا "ملک شاہ" بادشاہ بنا، تب بھی نظام الملک اس کا وزیر رہا۔

نظام الملک نے مملکت میں فقہا اور علما کے لیے کئی مکاتب اور مدارس تعمیر کروائے، جہاں درس و تدریس کے حلقے لگتے تھے اور صبح شام علما، میراث نبوی کی تقسیم میں مصروف کار رہتے تھے، اسی طرح کئی خانقاہیں تعمیر کروائیں اور اُنھیں آباد کروایا۔

ان سب کے تمام تر اِخراجات حکومت خود برداشت کرتی تھی اور اِن کی تمام تر ضروریات سرکاری خزانے سے پوری کی جاتی تھیں، جن میں کھانے پینے کا انتظام، کپڑے اور لکھنے پڑھنے کا سامان، دوات، قلم اور کتابیں بھی شامل تھیں۔

اور یہ صرف چند ایک مدارس کے ساتھ خاص نہیں تھا، بل کہ بیت المقدس سے لے کر شام کے تمام علاقے، کوفہ، بصرہ، خراسان کا پورا علاقہ اور سمرقند سے بھی میلوں دور تک جو بھی عالم یا طالب علم تھا، اس کے لیے یہ سارا اِنتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

پورے سال میں ان تمام اخراجات کی کل مقدار چھے لاکھ دینار تھی۔ (اس وقت کے حساب سے یہ رقم تقریباً اڑھائی کھرب روپے بنتی ہے)۔

بعض حاسدین نے سلطان ملک شاہ کو نظام الملک کی شکایت لگائی اور سلطان سے کہنے لگے:

یہ اتنی بڑی رقم جو بیت المال سے جا رہی ہے، اگر اِسے محفوظ کر لیا جائے تو اِس کے ذریعے ایک مضبوط لشکر قسطنطنیہ پر حملے کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔

(قسطنطنیہ کے فتح ہونے کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے، چناں چہ ارشاد نبوی کا مفہوم ہے:

"یقیناً قسطنطنیہ ضرور فتح ہوگا! آفرین ہو اُس لشکر کے سپہ سالار کے لیے اور مبارک باد ہو اُس لشکر کے لیے! (مسند احمد: 18975)

چناں چہ اس بشارت کو حاصل کرنے کے لیے ہر صاحب اقتدار کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ یہ عظیم مہم سرانجام دے کر یہ فضیلت حاصل

کر لے اور بہت سوں نے کوششیں بھی کیں، جن میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سلیمان بن عبدالملک بن مروان اور بہت سے عباسی خلفا بھی شامل ہیں۔

سلجوقی سلطنت کی حدود تو قسطنطنیہ سے جا ملتی تھی، اس لیے یقیناً ان کی رغبت زیادہ ہوگی اسے فتح کرنے میں، لیکن سلجوقی سلاطین بھی اسے فتح نہ کر سکے اور اُس کی فتح اللہ تعالیٰ نے سلطنت عثمانیہ کے ساتویں نوجوان خلیفہ سلطان محمد فاتح خان کے مقدر میں لکھی تھی، جنھوں نے جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ، مطابق مئی ۱۴۵۳ء کو حیرت انگیز طریقے سے یہ عظیم خطہ فتح کر لیا اور وہاں اسلام کا پرچم بلند کیا، جسے آج کل ''استنبول'' کہا جاتا ہے۔

سلطان نے نظام الملک سے باادب لہجے میں (کیوں کہ نظام الملک اس کے والد کا بھی وزیر رہ چکا تھا، اس لیے سلطان ملک شاہ ان کا ادب کرتا تھا، بل کہ ادباً انھیں ابا جان کہہ کر بھی پکارتا تھا) کہا:

''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ سالانہ بیت المال سے چھے لاکھ دینار اُن لوگوں پر خرچ کرتے ہیں جن سے نہ ہمارا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی یہ ہمیں کوئی نفع پہنچاتے ہیں۔''

یہ سن کر نظام الملک رو دیے اور اُنھوں نے سلطان ملک شاہ سے کہا:

''بیٹے! میں ایک عجمی بوڑھا، بازار میں مجھے نیلام کیا جائے اور بولی لگائی جائے تو کوئی مجھے پانچ دینار سے زیادہ میں نہیں خریدے گا اور تم ایک ترکی نوجوان ہو، اگر تمھیں نیلام کیا جائے تو شاید تمھاری کچھ زیادہ قیمت لگ جائے کہ تمھیں کوئی تیس دینار میں بھی خرید لے، اس سے زیادہ تمھاری کوئی اہمیت نہیں۔

میرے بیٹے! دراصل میں تمھارے لیے ایک لشکر تیار کر رہا ہوں۔ اس کا نام ہے: ''اندھیروں کا لشکر''۔ جب تمھارے لشکر رات کو میٹھی نیند سو جاتے ہیں تو یہ اندھیرے کے لشکری اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تنہائیوں میں، تاریکیوں میں ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور اِن کی زبانوں سے تمھارے لیے دعائیں جاری ہوتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگتے ہیں، تمھارے لیے بھی اور تمھارے لشکروں کی سرفرازی اور کام یابی کے لیے بھی۔

سچ پوچھو تو بیٹا! تم اور تمھارا لشکر اِن ہی کے طفیل جی رہے ہو، ان کی دعاؤں سے تم سربلند ہوتے ہو، ان کی برکت سے تم پر بارشیں برستی ہیں، ان ہی کے واسطے تمھیں روزی پہنچائی جاتی ہے اور اِن کی دعائیں آسمانوں کو چیرتے ہوئے سیدھی ساتویں آسمان پر پہنچ کر عرشِ معلیٰ پر دستک دیتی ہیں۔''

سلطان ملک شاہ سر جھکائے ندامت کے ساتھ اپنے بزرگ وزیر کی تقریر سنتا رہا اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس نے کہا:

''خوب، بہت خوب! اب تو میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے لیے اس طرح کے اور بھی لشکر تیار کریں۔''

(ماخوذ از: سراج الملوك للطرطوشي: 128
ط: من أوائل المطبوعات العربية - مصر)

سوال آدھا، جواب آدھا ۲۰ کے درست جوابات

۱ پانچ (سورۂ ابراہیم، سورۂ انبیاء، سورۂ نمل، سورۂ عنکبوت اور سورۂ زخرف)۔
۲ حضرت زکریا علیہ السلام
۳ 5374
۴ اِبن الہیثم
۵ کوہِ قراقرم
۶ ملائیشیا (جسے ''ایشین ٹائیگر'' بھی کہا جاتا ہے)۔
۷ فن لینڈ
۸ 1954ء (مغربی جرمنی نے فائنل مقابلے میں ہنگری کو شکست دی تھی)۔
۹ گیندے کا پھول
۱۰ ایک مصیبت سے نکلتے ہی دوسری مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔

قرآنی کوئز ۱۵ کے درست جوابات

۱ دو۔ سورۂ نساء اور سورۂ فتح میں۔
۲ سورۂ طٰہٰ۔
۳ الف کا۔
۴ سورہ مریم۔
۵ سورہ جمعہ

ذوقِ معلومات (۷۰) کا درست جواب

☆ مسجد اقصیٰ، فلسطین

اپنا گھر

شیدے کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں کبھی اِدھر دیکھتا تو کبھی اُدھر۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والے کی گرفت خاصی سخت تھی، اسی لیے بہت زور لگانے کے باوجود شیدا اپنا ہاتھ اس سے نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ تھک ہار کر اُس نے مزاحمت ترک کر دی اور بے چارگی سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ شخص اس کے کان کے پاس جھکا اور سرگوشی کی:

''چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

شیدے نے اقرار میں سر ہلایا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے لے کر پیدل ہی جا رہا تھا۔ ایسی عجیب صورت حال کا سامنا شیدے نے پہلی بار کیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک چائے کا ہوٹل دکھائی دیا تو وہ شخص اسے لیے ہوٹل میں جا بیٹھا اور بیرے کو اِشارے سے دو کپ چائے لانے کا کہا۔ اسی دوران میں وہ شخص شیدے کے ہاتھ پر اپنی گرفت ڈھیلی کر چکا تھا، لہٰذا شیدا اُس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

شیدے کا اصل نام رشید تھا۔ اس کے ماں باپ سڑک کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بعد رشید کے چچا اسے اپنے گھر لے گئے تھے۔ اس وقت اس کی عمر نو سال تھی۔ کچھ دن تو چچا اور چچی نے اس کا بہت خیال رکھا، مگر آہستہ آہستہ ان کا رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں میاں بیوی اسے بُری طرح مارنے لگے۔ رشید کو کافی عرصے بعد پتا چلا کہ اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اُس کے چچا نے بھائی کا گھر اپنے نام کروا لیا تھا۔ مکان ہتھیانے کے لیے وہ رشید کو اپنے ساتھ لے آئے تھے، تاکہ لوگوں کی زبانیں بند رہیں، مگر جیسے ہی گھر کے کاغذات چچا نے اپنے نام منتقل کروائے، رشید کا بُرا دور شروع ہو گیا تھا۔

آخر کار وہی ہوا جو ایسے مواقع پر ہوتا آیا ہے۔ ایک دن بہت زیادہ مار کھانے کے بعد رشید گھر سے بھاگ گیا اور جیسے تیسے کر کے دوسرے شہر پہنچ گیا۔ بھوک اور دربدر کی ٹھوکریں برداشت کرتے کرتے ایک دن وہ استاد بالم کی نظروں میں آ گیا۔ استاد بالم شہر کے تمام جیب کتروں کا استاد تھا۔ شہر کے تقریباً تمام جیب کترے اس سے تربیت حاصل کرنے کے بعد اِس طریقے سے اپنی روزی کما رہے تھے۔

استاد بالم نے جلد ہی رشید کی تربیت بھی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس فن میں مہارت حاصل کرتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب اس کا شمار بہترین جیب کتروں میں ہونے لگا۔ استاد بالم اسے شیدے کے نام سے مخاطب کیا کرتا تھا، پھر یہی نام مستقل اس کی پہچان بن گیا۔

شیدا تیرہ سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا اور اُستاد بالم کے پاس کام کرتے ہوئے اسے تین سال ہو چکے تھے۔ ان تین سالوں میں وہ کبھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اتنا صاف تھا کہ اس کے کام کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ استاد بالم بھی اپنے اس ہونہار شاگرد پر فخر کیا کرتا تھا۔

مگر وہ سوچ رہا تھا کہ آج کا دن اس کی زندگی کا بُرا دِن تھا۔ وہ صبح اپنے کام پر نکلا تو حسبِ عادت اس کی تیز نگاہیں اپنے شکار کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ بس اسٹاپ پر وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے کہ اسے بھی کسی

اکمل معروف۔ حیدر آباد

بس کا انتظار ہو۔ آنے جانے والی بسوں سے اترنے والے مسافر اُس کی روزی کا ذریعہ بنتے تھے۔

ایک بس آ کر رُکی تو اُس سے اترنے والا مسافر فوراً اُس کی نظروں میں آ گیا۔ ساٹھ پینسٹھ کی عمر کے اس شخص کی دونوں جیبیں معمول سے زیادہ پھولی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بس میں چڑھنے کے بہانے آگے بڑھا اور اُس مسافر کے بالکل قریب سے گزرا۔ ابھی اس کی دو اُنگلیاں نہایت سرعت اور غیر محسوس انداز میں اس کی جیب میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ اس شخص نے شیدے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک لمحے کے لیے شیدا سناٹے میں آ گیا۔ تین سال کے عرصے میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے اسے پکڑا ہو۔ اس کی ساری مہارت آج خاک میں مل گئی تھی۔

اب وہ ہوٹل میں اس کے سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس مسافر نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر اُس سے کہا:

''تمھیں شاید بہت حیرت ہوئی ہوگی کہ میں نے کس طرح تمھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ حیرت ہونی بھی چاہیے، کیوں کہ تمھاری مہارت بے مثال ہے، مگر ایک بات تم نہیں جانتے اور وہ یہ کہ میں ماضی میں خود بھی یہ کام کرتا رہا ہوں۔ تم نے میرا نام تو سنا ہوگا؟ مجھے شانی کہتے ہیں، شانی استاد۔'' وہ خاموش ہوا تو شیدا اُچھل پڑا۔

اس نے یہ نام استاد بالم کی زبان سے بارہا سنا تھا۔ بالم نے کئی مرتبہ اس بات کا ذکر کیا تھا کہ اس نے جس سے یہ فن سیکھا وہ شانی استاد تھا۔ شیدے کے چہرے پر اَب حیرت کے ساتھ ساتھ کچھ اطمینان کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔ کم از کم اس بات کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

''شانی استاد! آپ کو ہماری اس دنیا میں کون نہیں جانتا!؟ استاد بالم کے منہ سے آپ کا نام کافی مرتبہ سن چکا ہوں اور اَب مجھے اس کا بھی کوئی دکھ نہیں ہے کہ آج میں اپنے کام میں ناکام ہو گیا ہوں، کیوں کہ مجھے پکڑنے والا استادوں کا بھی استاد ہے۔'' شیدے نے یہ کہتے ہوئے خود بھی چائے کا گھونٹ بھرا۔

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ بالم تک تم کس طرح پہنچے اور تمھارے گھر والے کہاں ہیں؟'' شانی استاد نے دریافت کیا۔

جواب میں شیدے نے اپنے والدین کی حادثاتی موت اور چچا کی بدسلوکیوں کا ذکر کیا اور گھر سے بھاگ جانے سے استاد بالم تک پہنچنے کے تمام احوال مختصر طور پر بیان کر دیے۔

''میں یہ کام چھوڑ چکا ہوں، لیکن مجھے اس کام سے وابستہ افراد کے متعلق مکمل معلومات ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اب اس کام سے جان چھڑا لو۔ ایک بڑے کام میں میرا ساتھ دو، میرے ساتھی بن جاؤ۔'' شانی استاد نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کس طرح کا کام؟ اور پھر میں استاد بالم کو کیسے راضی کروں گا؟'' شیدے کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بالم میرا نام سنتے ہی تمھیں بخوشی میرے ساتھ کام کی اجازت دے دے گا، باقی رہی کام کی نوعیت، تو وہ تمھیں جلد ہی معلوم ہو جائے گی۔'' شانی استاد نے مطمئن انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے جناب! میں تیار ہوں، جیسے آپ چاہیں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا تو شانی استاد مسکرانے لگا۔

بالم سے شانی استاد تک آنے کا سفر صرف ایک روز میں طے ہو گیا۔ بالم نے یوں اچانک شانی استاد کا نام سامنے آنے پر حیرت کا اظہار بھی کیا اور شیدے کو بخوشی شانی استاد کے پاس جانے کی اجازت بھی دے دی۔ شانی استاد نے اسے جو پتا بتایا تھا وہ ایک قریبی شہر میں واقع ایک چھوٹے سے علاقے کا تھا۔

شیدا بس میں سوار ہو کر ایک گھنٹے بعد ہی دوسرے شہر جا پہنچا اور پھر اپنی مطلوبہ عمارت تک پہنچ گیا۔ دور سے ہی دکھائی دیتی یہ عمارت، تین منزل اور اچھے خاصے وسیع رقبے پر محیط تھی۔ شیدے نے نظر اُٹھائی تو عمارت کے درمیان بنے بڑے سے دروازے کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر انگریزی میں کچھ تحریر تھا، جو شیدے کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی وہ باہر کھڑا سر کھجا رہا تھا کہ اچانک بڑے دروازے میں بنا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک لڑکا، جو تقریباً شیدے کا ہی ہم عمر دکھائی دیتا تھا، اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے شانی استاد سے ملنا ہے۔ انھوں نے مجھے یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔'' شیدے نے اسے کہا تو ایک دم اس لڑکے کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ نظر آنے لگی اور وہ گرم جوشی سے مصافحہ کرنے آگے بڑھا۔

''اچھا جی، تو تم بھی اس راستے کے نئے مسافر ہو جس پر ہم چل رہے ہیں۔'' وہ لڑکا خوش مزاجی سے بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں؟'' شیدے کے لہجے میں الجھن تھی۔

''اندر تو چلو! باقی باتیں بعد میں سمجھتے رہنا۔'' وہ شیدے کا ہاتھ تھامے اسے اس عمارت کے اندر لے گیا۔

''میرا نام نعمان ہے، ویسے پہلے سب مجھے نومی کہتے تھے۔'' اس نے کہا

اور پھر اس عمارت کے بارے میں بتانے لگا:

''یہ تین منزلہ عمارت بارہ کمروں پر مشتمل ہے۔ دو کمروں میں شانی صاحب اور اُن کے گھر والے رہتے ہیں، جب کہ دیگر تمام کمرے، ہماری رہائش سمیت، مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔''

ایک برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ آگے بڑھے تو دو تین اور بھی ایسے لڑکے نظر آئے جو دس سے پندرہ سال کی عمر کے درمیان تھے۔ آخر کار ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر شانی استاد پر پڑی، وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی اسے دیکھ چکے تھے، لہٰذا وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور بہت محبت سے اسے مخاطب کیا:

''بہت اچھا کیا تم نے یہاں آ کر۔ میں تمھارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ بالم تمھیں نہیں روکے گا۔''

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' شیدے نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''ابھی تو تم نعمان کے ساتھ جاؤ اور منہ ہاتھ دھولو۔ کام بھی پتا چل جائے گا، اور ہاں، یہاں تمھارا نام شیدا نہیں، رشید ہے۔''

ان کی بات سن کر شیدے نے سر ہلایا۔ نعمان اسے لے کر پلٹا اور جب اپنے کمرے میں لایا تو رشید عرف شیدا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ ایک صاف ستھرا کمرا تھا جس میں آٹھ مختلف جگہوں پر چھوٹے سائز کے بستر لگے ہوئے تھے۔

''یہ کمرا ہمارا بیڈ روم ہے۔ ایسے تین کمرے اور ہیں جو دوسری اور تیسری منزل پر ہیں۔'' نعمان نے بتایا۔

''تم کتنے لڑکے یہاں پر ہو اور کرتے کیا ہو؟'' رشید نے حیرت زدہ انداز میں سوال کیا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں شانی صاحب تمھیں اس بارے میں آگاہ کر دیں گے۔'' اس نے جواب دیا تو رشید خاموش رہا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب رشید، نعمان اور دیگر بہت سے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا، جو تقریباً تیس سے زائد تھے اور اُن سب نے ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے کھانا کھایا تھا، کہ شانی صاحب اندر آتے دکھائی دیے۔ وہ رشید کے پاس رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور اُسے مخاطب کیا:

''رشید! تمھارے ذہن میں بہت سے سوالات جنم لے رہے ہوں گے۔ یہ لڑکے کون ہیں؟ میرے پاس کیا کرتے ہیں؟ میرا کام دھندا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو رشید! یہ سب لڑکے بھی تمھاری طرح یتیم ہیں اور یہ بھی کم و بیش اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں جس طرح کے حالات کا تم نے سامنا کیا ہے۔ میں چوں کہ خود بھی بچپن میں یتیم ہو گیا تھا، جب کہ میری عمر صرف چار سال تھی۔ میرے ماموں نے مجھے اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا تھا، چچا تایا کوئی تھا نہیں، رفتہ رفتہ میں بھی بالکل اسی طرح ایسے ہاتھوں میں پہنچ گیا جہاں سے تم اور یہ سب لڑکے گزر کر آئے ہیں۔ مجھ سے بڑا جیب کترا پورے شہر میں کوئی نہیں تھا۔ اس فن میں مہارت کی میری مثالیں دی جاتی تھیں۔

مگر پھر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ یہ سلسلہ روکنا پڑے گا۔ ہم کب تک کسی شانی، کسی شیدے اور کسی نومی کی یتیمی کو استعمال کرتے رہیں گے!؟ کوئی تو ہو جو ان کی صلاحیتوں کو کسی بہتر جگہ استعمال کرے۔ انھیں بھی زندگی گزارنے کے لیے وہی سب کچھ میسر ہو جو اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر میں رہنے والے بچوں کو ملتا ہے۔ بس اس خیال کے آتے ہی میں نے اس طرف پیش قدمی کی اور اِس ادارے کی بنیاد رکھی جس کا نام ''اپنا گھر'' ہے۔ آہستہ آہستہ خود بھی اس دلدل سے نکلا اور ایسے بچوں کی تلاش شروع کی جو اِس دلدل سے نکلنا چاہتے ہوں، جو پڑھ لکھ کر یا کوئی ہنر سیکھ کر ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے ہوں۔

میری تیز نگاہیں ایسے لڑکے تلاش کر لیتی ہیں جنھیں مجبوری میں کیے گئے ان بُرے کاموں سے جان چھڑانے کے راستے کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ لڑکے ابھی تیس سے زیادہ ہیں اور پندرہ سال کے دوران میں مجموعی طور پر اَب تک ڈیڑھ سو یتیم بچے پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں یا پھر کوئی ہنر سیکھ کر عزت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت بھی ہماری مدد کرتی ہے اور فنڈز کی فراہمی میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اچھے اساتذہ اور ہنر مند اَفراد ان لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کوئی ہنر سیکھنا چاہتے ہو یا اپنی تعلیم مکمل کرتے ہو۔''

''میں اپنی تعلیم کا آغاز کرنا چاہوں گا۔ مجھے شیدا نہیں، بل کہ رشید بن کر زندگی گزارنی ہے۔ آپ نے روشنی پھیلانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے میں اسے آگے بڑھاؤں گا۔ ہمیں تعلیم مکمل کر کے صرف اپنی نئی زندگی کا آغاز ہی نہیں کرنا، بل کہ آپ کی طرح اور دیگر دوستوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے۔ انھیں بھی بُرے راستوں سے ہٹا کر ''اپنا گھر'' تک لانا ہے۔''

رشید کے لہجے کی سچائی اور عزم بتا رہا تھا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے قدرت ایک اور شانی صاحب میدان میں اتار چکی ہے۔

فسطاط

انتخاب: عبدالعزیز۔ کراچی

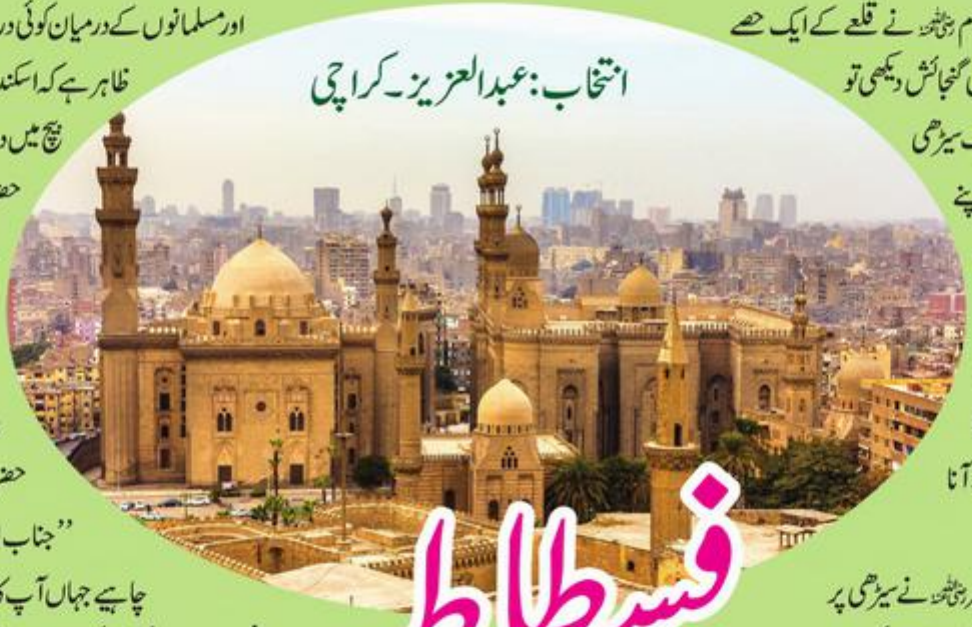

سکندر مقدونی نے جب ملک مصر فتح کیا تو اپنا پایۂ تخت، بحر روم کے ساحلی علاقے کو بنایا اور وہاں ایک نیا شہر بسایا جو آج تک سکندر ہی کے نام پر ''اسکندریہ'' کہلاتا ہے۔ اسکندریہ بھی صدیوں تک مصر کا پایۂ تخت رہا۔ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر پر حملہ کیا اس وقت تک مقوقس کا دارالحکومت اسکندریہ ہی تھا۔

اور جس جگہ آج قاہرہ آباد ہے وہاں کوئی بڑا شہر موجود نہ تھا، بل کہ ایک فوجی قلعہ تھا، جو حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور اُن کے رفقا نے مصر کے چند ابتدائی علاقے فتح کرنے کے بعد اِس قلعے کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ چھے مہینے تک جاری رہا۔ اس پورے عرصے میں قلعے پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہ نکلا۔ بالآخر چھے ماہ گزرنے کے بعد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے قلعے کے ایک حصے میں پاؤں رکھنے کی کوئی گنجائش دیکھی تو قلعے کے اس حصے پر ایک سیڑھی نصب کردی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''میں اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ہدیہ کرتا ہوں، جو میرے پیچھے آنا چاہے آجائے۔''

یہ کہہ کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کیا۔ آپ کے پیچھے اور بھی متعدد حضرات سیڑھی پر چڑھنے لگے، یہاں تک کہ سب سے پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قلعے کی فصیل پر پہنچ گئے۔ دوسرے حضرات کو حوصلہ ہوا اور اُنھوں نے مزید سیڑھیاں لگا کر چڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی اور مقوقس نے بھاگ کر جزیرے کے قلعے میں پناہ لی۔

علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ سیڑھی جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے قلعے پر چڑھنے کے لیے استعمال فرمائی تھی ۳۹۰ھ تک سُوق وردان کے ایک گھر میں محفوظ تھی، پھر ایک آتش زدگی کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔

اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا خیمہ قلعے کے سامنے نصب فرمایا تھا۔ پیش قدمی کا اِرادہ فرمایا تو اِس خیمے کو اُکھاڑ کر ساتھ لے جانا چاہا، لیکن جب اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیمے کے اوپر کی جانب ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں اور اُن پر بیٹھی ہے۔ خیمہ اکھاڑنے سے یہ انڈے ضائع ہوجاتے، اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کبوتری نے ہمارے خیمے میں پناہ لی ہے، اس لیے اس خیمے کو اُس وقت تک باقی رکھو جب تک یہ بچے پیدا ہوکر اُڑنے کے قابل نہ ہوجائیں، چناں چہ خیمہ باقی رکھا گیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ چند اَفراد کو وہاں چھوڑ کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اسکندریہ کی فتح میں بھی چھے مہینے لگے، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ کو اپنا مستقر بنانے کے لیے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب فرمائی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ ''مسلمانو! کسی ایسی جگہ کو اپنا مستقر نہ بناؤ جہاں میرے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی دریا یا سمندر حائل ہو''۔

ظاہر ہے کہ اسکندریہ کو مستقر بنایا جاتا تو بیچ میں دریا حائل ہوتا، اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنے رفقا سے مشورہ کیا کہ ''ہم کس جگہ کو اپنا مستقر بنائیں؟'' اس پر بعض حضرات نے مشورہ دیا:

''جناب امیر! ہمیں اسی جگہ جانا چاہیے جہاں آپ کا خیمہ نصب ہے، وہاں پانی (دریائے نیل) بھی ہمارے قریب ہوگا اور ہم صحرا میں بھی نہیں ہوں گے۔''

چناں چہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو قبول فرمایا اور اُسی جگہ واپس تشریف لے آئے جہاں خیمہ نصب تھا اور یہاں مسلمانوں کا ایک شہر آباد کیا۔ اس وقت تک شہر کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا، اس لیے لوگ چند روز تک پتا بتانے کے لیے اسی فسطاط (خیمے) کا حوالہ دیتے رہے کہ ''میری جگہ فسطاط کی دائیں جانب ہے۔'' کوئی کہتا کہ ''میری جگہ فسطاط کے بائیں جانب ہے۔'' ہوتے ہوتے اس شہر کا نام ہی فسطاط مشہور ہوگیا۔

ایک کبوتری کے انڈے بچانے کی غرض پر بن جانے والا یہ شہر، مصر میں مسلمانوں کا پایۂ تخت قرار پایا اور صدیوں تک اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بنا رہا۔

ایک سی کہانی

فاتح کون ۲

۶

نذیرانبالوی۔لاہور

اجمل رکشے کو ایک طرف کھڑا کر کے اس طرف بھاگا جس طرف کاشف اور اُس کے دوست گئے تھے۔اس سے پہلے کہ اجمل، کاشف کے قریب جاتا ایک ٹرک سڑک سے گلی کی طرف مڑا۔ اتنی دیر میں کاشف اور اُس کے دوست اندھیری گلیوں میں غائب ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اجمل رکشے کے قریب واپس آ گیا۔

اکمل ابھی تک اپنی ماں کی گود میں بے خبر سو رہا تھا۔ اس سے قبل کہ صائمہ کوئی سوال کرتی، اجمل نے موبائل فون کے ذریعے کاشف کے والد انور سے رابطہ کیا۔

''بولو اجمل! کیا حال ہے؟''

رابطہ ہونے پر انور نے بات شروع کی۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

اجمل نے پوچھا۔

''مراد چوک میں کھڑا ہوں، تھوڑی دیر میں گھر جاؤں گا۔

''کیوں؟ کیا ہوا ہے؟''

صائمہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''انور کا بیٹا اس نوبل کڑاہی سے بھاگا ہے۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے۔ میں نے اس کا تعاقب بھی کیا، لیکن وہ اور اُس کے ساتھی اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ لگتا ہے اندر کوئی جھگڑا ہوا ہے۔''

اجمل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک ایمبولینس ہوٹر بجاتی ہوئی نوبل کڑاہی کے سامنے آ کر رُکی۔ تین چار آدمی تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد اسٹریچر پر زخمی تبسم کو باہر لایا گیا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ اجمل نے ایک رکشا روک کر صائمہ اور اکمل کو اُس میں سوار کروا دیا تھا۔ ایمبولینس کے جانے کے بعد اجمل اپنا رکشا گلی میں لے گیا۔ جب انور وہاں آیا تو

خیریت تو ہے؟''

''تم اس وقت نوبل کڑاہی کے قریب آ سکتے ہو؟''

''نوبل کڑاہی؟ ہاں ہاں، آ جاتا ہوں، پھر کوئی لڑائی جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟''

''بس تم جلدی آ جاؤ''

یہ کہہ کر اجمل نے فون بند کر دیا۔

''نیک بخت! میں تمھیں رکشے میں سوار کروا دیتا ہوں، تم گھر جاؤ''

اجمل نے صائمہ کو مخاطب کیا۔

ساری بات جان کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے کاشف سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر اُس کا موبائل فون بند تھا۔

پولیس نے نوبل کڑاہی کے ملازمین کے بیانات قلم بند کیے اور خفیہ کیمرے کی ریکارڈنگ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

''اچھا! تو یہ چار نوجوان ہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

انسپکٹر عبداللہ نے غصیلے انداز میں کہا۔

رات گئے پولیس نے انور کے گھر پر چھاپا مارا۔

انسپکٹر عبداللہ، اعجاز کو گرفتار کرنے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ اس کی نشان دہی پر کاشف، شہزاد اور دانیال کے گھروں پر چھاپے مارے جا رہے تھے۔

''کاشف تو گھر نہیں آیا۔''

انور کی بات سن کر انسپکٹر عبداللہ نے کہا:

''تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارے اوپر بہت دباؤ ہے، تمھیں حوالات میں دیکھ کر کاشف ضرور گرفتاری دے دے گا۔''

''میں اسے خود آپ کے حوالے کروں گا، آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔ اگر کل تک کاشف کو آپ کے سامنے پیش نہ کر سکا تو میں خود آپ کے پاس آجاؤں گا، بس ایک موقع دیجیے، میں بھاگوں گا نہیں۔''

انور نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں جا تو رہا ہوں، مگر میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا، صرف کل شام تک انتظار کروں گا۔''

انسپکٹر عبداللہ، انور کو گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

انور سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا کاشف ایسا کرے گا۔ گھر میں اس کی ماں اور بہن بھی پریشان تھیں۔

انور نے پیسا کمانے کا ہر راستہ اختیار کیا تھا۔ بے ایمانی کا راستہ اس کا اپنا چُنا ہوا تھا، جس پر چلتے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کا ہم سفر اجمل بھی تھا۔ دونوں بے ایمانی سے دوسروں پھل فروشوں کے مقابلے میں زیادہ پیسے کماتے تھے۔ انور چاہتا تھا کہ کاشف پڑھ لکھ کر ایک اچھا انسان بن جائے۔

وہ اپنے بیٹے کو تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گراؤنڈ، ہوٹل، کیرم کی دکان اور برگر ہاؤس، اس نے سب جگہوں پر کاشف کو تلاش کیا، مگر وہ اسے کہیں نہیں ملا۔

''ہوسکتا ہے وہ اپنی پھوپھی عالیہ کے ہاں چلا گیا ہو، میں عالیہ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' انور نے بڑبڑاتے ہوئے عالیہ کو فون کیا۔

''جی بھائی جان! کاشف ہمارے ہاں ہی ہے، وہ رات گیارہ بجے آیا تھا۔'' عالیہ نے بتایا۔

''میں آرہا ہوں، اسے کہیں جانے مت دینا، اس پر نظر رکھنا۔'' انور اَب جلد سے جلد عالیہ کے ہاں جانا چاہتا تھا۔

کاشف نے پھوپھی کی آواز سن لی تھی۔ وہ باہر جانے لگا تو عالیہ نے اسے روک لیا۔

''پھوپھی جان! میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔''

''تمھارے ابو آرہے ہیں۔''

عالیہ بولی۔

''ابو جان؟''

کاشف نے دہرایا۔

''بھائی جان آجائیں تو پھر چلے جانا۔''

''ابو کیوں آرہے ہیں؟''

کاشف کے لہجے میں گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔

''انھوں نے بتایا نہیں، تم آرام سے بیٹھو، وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔''

عالیہ نے یہ کہہ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کاشف نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔

''اب میں بچ نہیں پاؤں گا، پکڑا جاؤں گا، میں نے چُھری سے ہوٹل کے ملازم پر حملہ کیا تھا، نہ جانے وہ اب زندہ بھی ہو گا یا......''

کاشف خوف کے مارے بڑبڑا رہا تھا کہ اچانک ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ اس کے سامنے اس کے ابو کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ میری محبت، میری محنت کا تم نے یہ صلہ دیا ہے۔ پولیس ہمارے گھر آئی تھی۔ خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔ اب محلے میں کس کس کو اپنی صفائی پیش کروں گا، کس کس سے منہ چھپاؤں گا۔''

اب کمرے میں ابو کی سسکیاں اور ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کاشف اور عالیہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ دونوں بھی رونے لگے۔

''ابو جان! میں شرمندہ ہوں، میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔''

کاشف ہاتھ باندھے ابو جان کے سامنے کھڑا تھا۔

''آجاؤ میرے ساتھ۔''

انور نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

رات کے آخری پہر انور اپنے بیٹے کو لیے انسپکٹر عبداللہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے انور کو بغور دیکھتے ہوئے کہا:

''تم نے اپنا وعدہ نبھادِیا ہے۔ دعا کرو، ہوٹل کے ملازم تبسم کی جان بچ جائے، اگر وہ مر گیا تو......''

''نہیں، نہیں، انسپکٹر صاحب! اللہ نے چاہا تو تبسم ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نادم ہوں، غصہ مجھ پر غالب آگیا تھا۔ میں اب غصہ نہیں کروں گا۔''

کاشف نے روتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

انسپکٹر عبداللہ نے کہا۔

صبح تک چاروں دوست حوالات میں بند تھے اور اُن کے لواحقین تھانے کے باہر بیٹھے تھے۔ سب پریشان تھے۔

اگرچہ چاروں کے والد خاموش تھے، مگر اُن کے اردگرد شور برپا تھا۔

کاشف کے والد انور نے پیسا کمانے کے لیے بے ایمانی سے دوستی کی تھی۔ کم تولنا اور اچھے پھل دکھا کر شاپنگ بیگ میں گلے سڑے پھل ڈال دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انور کو بے ایمانی کا ایک جملہ بار بار سنائی دے رہا تھا:

''میں کام یاب ہوگئی، میں نے ایمان داری کو شکست دے دی ہے۔ دور دور تک ایمان داری کا نام ونشان نہیں ہے، میں جیت گئی۔''

''نہیں نہیں، میں تمھیں شکست دوں گا، میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری دشمن ہو، میں ایمان داری کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا۔''

انور کے اردگرد ہونے والے شور سے وہاں موجود سبھی لوگ واقف ہو گئے تھے۔ اعجاز کے والد شوکت نے انور کا ہاتھ پکڑا۔

''بے ایمانی نے مجھے بھی گم راہ کر دیا تھا، مجھ پر بھی ہر وقت پیسا کمانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کی اور خوب پیسا اکٹھا کیا۔

بے ایمانی نے اس طرح مجھے اپنے سحر میں مبتلا کیا کہ ایمان داری کا راستہ مجھ سے دور سے دور تر ہوتا چلا گیا۔ میں اپنے بیٹے کو پیسے تو دیتا رہا، مگر اُس کی تربیت سے غافل ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ دن رات کیا کرتا پھرتا ہے۔'' شوکت صاحب کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''میری کہانی بھی آپ لوگوں سے مختلف نہیں ہے، میں نے اپنے اختیارات کا ناجائز اِستعمال کیا، رشوت کے نوٹوں سے جیب بھری، خوب پیسے اکٹھے کیے، عالی شان بنگلہ بنایا، قیمتی گاڑی لی، عمدہ لباس اور جوتے خریدے، مگر اَولاد پر نظر نہ رکھ سکا، اس سے غافل رہا۔''

دانیال کے والد رِضوان بولتے چلے گئے۔

شہزاد کے والد اَمجد کی کہانی بھی ایسی ہی تھی۔ وہ تعمیرات کے شعبے سے وابستہ تھے۔ مکان بناتے ہوئے گھٹیا میٹیریل کا استعمال کرتے۔

مکان بظاہر تو خوب صورت دکھائی دیتا، مگر اُس کی اندرونی حالت بہت اچھی نہ ہوتی۔ یوں انھیں ایک ہی مکان میں لاکھوں روپے کی بچت ہو جاتی تھی۔

یہاں بھی بے ایمانی نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ سبھی بے ایمانی کی گرفت میں تھے اور سب کے بیٹے حوالات میں بند تھے۔ سب کی کہانی ایک سی تھی۔ سب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔

اتنے میں انسپکٹر عبداللہ اپنے کمرے سے نکل کر اُن کی طرف بڑھے۔

''میں زخمی تبسم کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

چاروں والد حضرات انسپکٹر عبداللہ کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

(انسپکٹر عبداللہ نے زخمی تبسم کے بارے میں کیا بتایا؟

یہ جاننے کے لیے پڑھیے اگلی قسط)

☆ آپ کا کردار ہی آپ کی پہچان ہے، ورنہ ایک نام کے لاکھوں انسان ہیں۔

☆ انسان واحد ایسی مخلوق ہے جس کا زہر الفاظ میں ہوتا ہے۔

☆ احساس کا مرجانا انسان کے مرجانے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

☆ جب سایہ قد سے بڑا اور باتیں اوقات سے بڑی ہونے لگ جائیں تو سمجھ جائیں سورج غروب ہونے والا ہے۔

☆ وقت کو پیدا کرنے والے کو وقت دے کر دیکھو، وہ تمھارا وقت بدل دے گا۔

☆ حاسدین سے بہترین بدلہ یہ ہے کہ تم انھیں اور زیادہ کام یاب ہو کر دکھاؤ۔

(ہانیہ ناز بنت منور۔کراچی)

☆ اگر تنقید ہی کرنی ہو تو نرم لہجے میں کریں، کیوں کہ نرم لہجہ ضمیر جگاتا ہے، جب کہ سخت لہجہ اَنا کو جگاتا ہے۔

☆ حسد کا جذبہ احساس کم تری سے پیدا ہوتا ہے۔

☆ ادب کا دروازہ اتنا چھوٹا اور تنگ ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہونے سے پہلے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔

(عبدالواحد۔ٹنڈو الہ یار)

☆ اچھے لوگ خوشیاں دیتے ہیں اور بُرے لوگ سبق۔

☆ کبھی کبھی زبان سے انجانے میں ادا کیے گئے الفاظ سننے والے پر صدیوں کا بوجھ چھوڑ جاتے ہیں۔

(باقر علی۔لودھراں)

☆ تکلیف کی انتہا تب ہوتی ہے جب آپ اس انسان کے لیے کچھ نہ رہیں جس کے لیے آپ سب کچھ کرتے رہے ہوں۔

☆ وقت، موسم اور لوگ، سب کی ایک سی فطرت ہوتی ہے۔ کب، کون، کہاں بدل جائے، پتا ہی نہیں چلتا۔

(رقیہ بنت محمد ریحان۔اسلام آباد)

☆ بے کار علم وہ ہے جو صرف زبان پر رہے اور فائدہ مند علم وہ ہے جو کردار سے ظاہر ہو۔

☆ اگر لوگ آپ کو قبول نہیں کرتے تو مایوس نہ ہوں، کیوں کہ لوگ اکثر اس چیز کو چھوڑ دیتے ہیں جس کی وہ قیمت نہیں دے سکتے۔

☆ جنازہ راہ نمائی کرتا ہے پیچھے چلنے والوں کی۔ انھیں وہ راستہ دکھاتا ہے جو وہ بھول بیٹھے ہوتے ہیں۔

(ہبہ اون۔آسٹریا)

☆ دیر سے بنو، لیکن کچھ بنو، کیوں کہ لوگ وقت کے ساتھ ساتھ خیریت کے بجائے حیثیت پوچھنے لگتے ہیں۔

☆ زمانے کا شکوہ نہ کرو، بل کہ خود کو بدلو، کیوں کہ پاؤں کو گندی سے بچانے کا طریقہ جوتا پہننا ہے، نہ کہ سارے شہر میں قالین بچھانا۔

(مہرون النساء۔امریکا)

بکھرے موتی

قارئین

ننھے میاں کی سائیکل

سیف الرحمن سیفی۔ ملتان

ننھے میاں کی سائیکل کافی پرانی ہو چکی تھی۔ اس کے ہر حصے سے کچھ عجیب و غریب آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔

مڈگارڈ زنگ آلود ہو چکا تھا، ہینڈل ٹوٹ چکا تھا، چین کی کئی بار مرمت ہو چکی تھی۔ گدی کو آئے روز کسوانا پڑتا تھا، ورنہ عین موقع پر دغا دے جاتی تھی۔

اور بتی کا تو صاحب! کچھ مت پوچھیے، دن میں سارا وقت چودہ طبق کی طرح روشن رہتی، لیکن جوں ہی سورج ڈھلا اور اُس نے نہ جلنے کی جیسے قسم کھالی۔ بہتیرا اُسے کھول کر دوبارہ فٹ کیا، سیل بدلوائے، شیشہ پالش کروایا، لیکن آفرین ہے! اس بتی کو رات کو نہ جلنا تھا نہ جلی۔ تھک ہار کر ننھے میاں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

گھنٹی کا حال سنیے، زنگ آلود تو خیر کب سے تھی، لیکن بجتی بہر حال تھی، لیکن بجنے میں بھی اس کا ضابطہ کسی طور بتی سے کم نہ تھا۔ جہاں نہیں بجنا ہوتا تھا وہاں خوب بجتی تھی اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں چپ کا روزہ۔ اسی خاموشی کے مارے ننھے میاں کئی بار راہ گیروں اور ریڑھیوں میں جا ٹھکے تھے۔

ایک بار تو ایک دھوبی سے یوں بری طرح ٹکرائے کہ آپ سائیکل کے نیچے، سائیکل کے اوپر دھوبی کی گھٹڑی، گھٹڑی کے اوپر بے چارا دھوبی چاروں شانے چت اور مغلظات کا ایک فوارہ تھا جو دھوبی کے منہ سے اُبل رہا تھا۔ آس پاس راہ گیروں کا جمگھٹا، جو کافی دیر تو سمجھ ہی نہ پایا کہ ہوا کیا ہے، پھر اُنھوں نے بڑی مشکل سے دونوں کو اُٹھایا، دھوبی کو سوڈا واٹر پلایا، پھر کہیں جا کر دھوبی صاحب کے حواس بحال ہوئے اور ننھے میاں کی جان خلاصی ہوئی۔

داہنی آنکھ کے اوپر جو نیل کا نشان ہے وہ اسی واقعے کی یادگار ہے۔

سائیکل جتنی بھی کباڑا سہی، لیکن اڑے وقتوں میں کام بھی آجاتی تھی۔

آپا کو گوٹا کناری منگوانی ہوتی، کہانیوں کی کتابیں بدلوانا ہوتیں، ننھے میاں یاد فرمائے جاتے۔ بنو کو سہیلیوں کے گھروں میں لے جانا یا واپس لے آنا ہوتا، یہی سائیکل کام آتی، لیکن واپسی پر بے چاری بنو کا انجر پنجر ہل چکا ہوتا۔ دادی اماں کے پان اسی شاہی سواری پر آتے۔ وہ اور بات ہے کہ آدھی ڈھولی میں سے بھی درجن، ڈیڑھ درجن کم ہوتے۔ دہی ننھے میاں اسی سائیکل پر لاتے، جو واپسی پر لسی بن چکی ہوتا۔ سبزی کا تھیلا تو ضرور ہی گر جاتا، آلو بینگن دور دور تک لڑھکتے جاتے۔

ننھے میاں کئی بار ابا جان سے نئی سائیکل کی فرمائش کر چکے تھے۔ امی جان کی سفارش بھی پیش ہو چکی تھی، آپا سے علاحدہ کہلوایا تھا، لیکن ابا ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔

پہلی شرط تو یہی تھی کہ سالانہ امتحان میں اول آؤ، پھر نئی سائیکل ملے گی۔

دوسری شرط یہ کہ بنو سے لڑائی جھگڑا کم کرو، زیادہ نہیں تو اُس کی پونیاں اور رنگین پنسلیں چھپانا بند کر دو۔ تنگ آ کر وہ بھی تمھاری گیند آئے دن

پانی کی ٹینکی میں ڈال دیتی ہے۔تم دونوں کی شرارتیں کم ہوں گی تو گھر میں کچھ سکون کی فضا قائم ہوگی۔

زمین ادھر کی اُدھر ہوجائے،لیکن ننھے میاں، بنو کو ستانا نہیں چھوڑ سکتے۔

اور جناب! حیران مت ہوں، بی بنو بھی ننھے میاں سے کم ہرگز نہیں ہیں، نہلے پہ دہلا ہیں! تاک میں رہتی ہیں اور پورا بدلہ لیتی ہیں۔

رہ گئی اول آنے کی بات! ویسے تو ننھے میاں ذہین ہیں،لیکن جم کر پڑھنے کی شرط ہے! ہوم ورک کر لیتے ہیں، سبق یاد کر لیتے ہیں، آموختہ دہرا لیتے ہیں۔ تیسری چوتھی پوزیشن بھی آہی جاتی ہے،لیکن اول آنے کی امید ذرا کم ہی ہے۔

اب چراغ تو شہر سے متروک ہوئے کہ کہیں سے الہ دین کا چراغ ہاتھ لگے اور ننھے میاں چراغ کے جن کو نئی سائیکل کا حکم دے ڈالیں۔

پریوں کی امید باقی ہے کہ وہی شاید کہیں ٹکرا جائیں اور مہربانی کریں،لیکن اللہ جانے! یہ پریاں کہاں رہتی ہیں؟ مکھیاں تو تمام سال بن بلائے مہمان کی طرح بھنبھناتی رہتی ہیں۔

ایک دن تو سمجھو کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا! دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں، اس کا ننھے میاں کو مطلق اندازہ نہ تھا۔

ساری رات خواب میں بھانت بھانت کی سائیکلیں دیکھیں، خوب چلائیں۔ اتنی خوب صورت، اتنی سبک رفتار کہ مانو بادلوں میں تیر رہے ہوں۔صبح اٹھے تو ڈیوڑھی میں بالکل نئی نکور چمچماتی ہوئی سائیکل کھڑی پائی۔خوش ہوگئے کہ ہو نہ ہو، پرستان سے کسی پری نے بھیجی ہے۔اتفاق سے چھٹی کا دن تھا۔امی اتوار بازار گئی ہوئی تھیں، بنو اپنی سہیلی کے گھر اور آپا صاحبہ معمول کے مطابق کہانیوں کی کتاب میں گم، گویا میدان بالکل صاف تھا۔

ننھے میاں نے اپنی سائیکل پر دو حرف بھیجے اور نئی سائیکل اٹھا کر باہر نکل کھڑے ہوئے۔پورا علاقہ گھوم ڈالا۔کون سی ایسی سڑک یا گلی تھی جہاں سے ننھے میاں سائیکل پر سوار نہ گزرے ہوں۔انھیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

راستے میں جو دوست ملا اسے سائیکل پر بٹھا کر ایک دو چکر تو لگوا ہی ڈالے۔ کچھ بچوں کو جھولے دلوائے۔

گھنٹی کی آواز تو ایسی سریلی تھی کہ بار بار بجانے پر بھی جی نہیں بھرتا تھا۔اس کی ٹناٹن تو دنیا سے نرالی تھی۔

گھومتے گھماتے پارک میں آنکلے۔

روش پر لوگ ہوا خوری کر رہے تھے، مٹرگشت ہو رہا تھا،لیکن یہ حضرت سب سے بے نیاز سائیکل چلانے میں مصروف تھے۔

وہاں سے ہٹے تو گھاس پر چلانا شروع کر دی۔رات کی بارش کی وجہ سے گھاس خوب گیلی تھی اور آگے کچی زمین پر کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ترنگ میں آکر جو زور سے پیڈل گھمایا تو سنبھال نہ پائے۔سائیکل لہراتی اور گھسٹتی ہوئی ننھے میاں سمیت کیچڑ میں جا گری۔دونوں کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔آس پاس سے لوگ دوڑے دوڑے آئے۔ننھے میاں کو کیچڑ سے نکالا اور گھر کا پتا پوچھ کر گھر پہنچایا۔

گھر پہنچے تو سب آچکے تھے۔

ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے بنو سے مڈبھیڑ ہوئی۔اللہ جانے، واقعی پہچان نہیں پائی تھی یا جان بوجھ کر اُس نے بھوت بھوت چلانا شروع کر دیا تھا۔سب گھر والے اکٹھے ہوگئے۔پہلے تو انھیں نہلایا گیا، اُجلے کپڑے پہنائے گئے، پھر سب نے، یعنی ابا جان، امی جان، دادی جان، آپا بی نے حسبِ توفیق خوب خاطر تواضع فرمائی۔

ابا جان نے تو ایسے زور سے کان اینٹھے کہ ننھے میاں نے کئی بار آئینے میں دیکھے کہ کہیں لمبے تو نہیں ہوگئے؟

اب سائیکل کا معمہ یوں حل ہوا کہ سامنے والے انکل اپنے بیٹے کو تحفہ دینے کے لیے لائے تھے اور دو گھنٹے کے لیے ڈیوڑھی میں رکھوائی تھی، جسے پوچھے بنا ہی ننھے میاں لے اڑے تھے۔خیر، ننھے میاں سے ہی دھلوائی اور انکل سے معافی منگوائی۔

تو جناب! ابا جان نے سزا کے طور پر ننھے میاں کی پھٹیچر سائیکل چھت والی کوٹھڑی میں رکھوا کر تالا لگوا دیا ہے اور کہا ہے کہ فی الحال سائیکل کو تو بھول جاؤ۔ سالانہ امتحان میں اول آؤ گے تو ملے گی، ورنہ بالکل نہیں۔

اس دن کے بعد سے راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

بنو سے لڑائی جھگڑا بالکل بند ہے۔

ننھے میاں خوب پڑھائی فرما رہے ہیں کہ سالانہ امتحان میں اول پوزیشن آئے اور سائیکل ملے۔

سو، آپ بھی ننھے میاں کے لیے دعا کریں، ہم تو خیر کر ہی رہے ہیں۔

بقیہ: جھوٹوں کے جھوٹے

ان جاسوسوں سے جب اسے یہ اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی غائب ہوگیا اور ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! اس کے غائب ہونے پر اُس کے گرویدہ لوگ شرمندہ ہو رہے تھے، لیکن پھر اُنھوں نے اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے اعلان کیا:

''جلد ہی ان کا نبی پھر ظاہر ہوگا اور اِس طرح ظاہر ہوگا کہ سب لوگ اس کی نبوت کو تسلیم کرلیں گے۔''

.....(جاری ہے).....

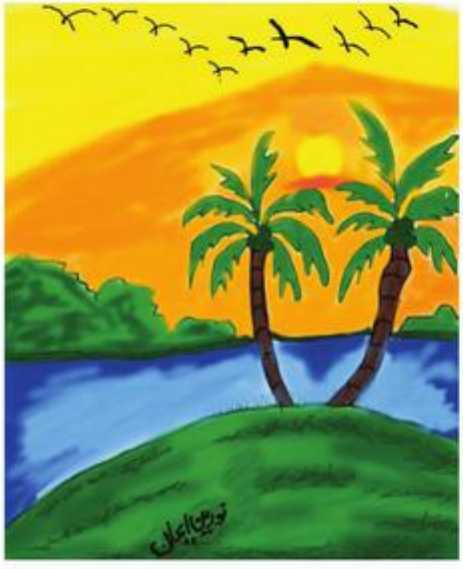

لالچ کا انجام

محمد ہانی رفیق زم زمی۔ کراچی

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا، جس کا نام صلاح الدین تھا۔ صلاح الدین بہت نیک، اچھا اور خوش اخلاق انسان تھا، ہر کسی کی مدد کرتا تھا، لیکن صلاح الدین بہت غریب تھا۔ صلاح الدین کا ایک دوست تھا، جس کا نام منیر تھا۔ منیر بہت مال دار اور لالچی انسان تھا۔

ایک دن صبح سویرے جب صلاح الدین اپنے کام پر گیا تو راستے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے دیکھا تو کوئی چیز زمین میں مدفون تھی۔ اس نے بے چینی سے جلدی جلدی اس جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے ایک برتن دکھائی دیا۔ اس نے وہ برتن نکالا اور اُسے لے جا کر اپنے دوست منیر کو دکھایا۔ اس برتن پر بہت مٹی جمی ہوئی تھی۔ منیر نے برتن کو دیکھا تو اُس کی نیت خراب ہونا شروع ہوگئی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ یقیناً کوئی قیمتی برتن ہے۔

منیر نے صلاح الدین سے کہا:

''تم اس برتن کو میرے پاس چھوڑ کر کام پر چلے جاؤ، تمھیں دیر ہو رہی ہوگی۔ میں اس کے بارے میں کسی سے معلوم کرتا ہوں۔''

بھائی! تمھاری مہربانی، پھر کل آ کر تم سے ملتا ہوں۔ صلاح الدین یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

منیر وہ برتن لے کر سُنار کے پاس گیا۔

''جناب! یہ تو بہت قیمتی برتن ہے، لاکھوں کا بکے گا۔'' سُنار نے منیر کو بتایا۔ منیر کا گمان سچ ثابت ہوا۔ منیر نے لالچ میں آ کر وہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے گھر والوں کو لے کر راتوں رات دوسرے شہر روانہ ہوگیا۔

اگلے دن جب صلاح الدین، منیر کے گھر پہنچا تو گھر پر تالا دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اسی طرح کئی دنوں تک صلاح الدین اس کے گھر پر چکر لگاتا رہا۔ اس نے پڑوسیوں سے بھی معلوم کیا، مگر اُس کو کوئی سراغ نہیں ملا۔

''کہیں منیر نے مجھے دھوکا تو نہیں دے دیا؟'' اچانک صلاح الدین کے ذہن میں خیال آیا۔ ''نہیں نہیں، میرا دوست ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو میرے ساتھ بہت مخلص تھا۔'' صلاح الدین نے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔

ادھر منیر وہ برتن بیچ کر راتوں رات امیر ہوگیا۔ اس نے اپنی دکان کھول لی۔ دن رات کاروبار بڑھانے اور پیسا کمانے کی دھن اس پر سوار تھی۔

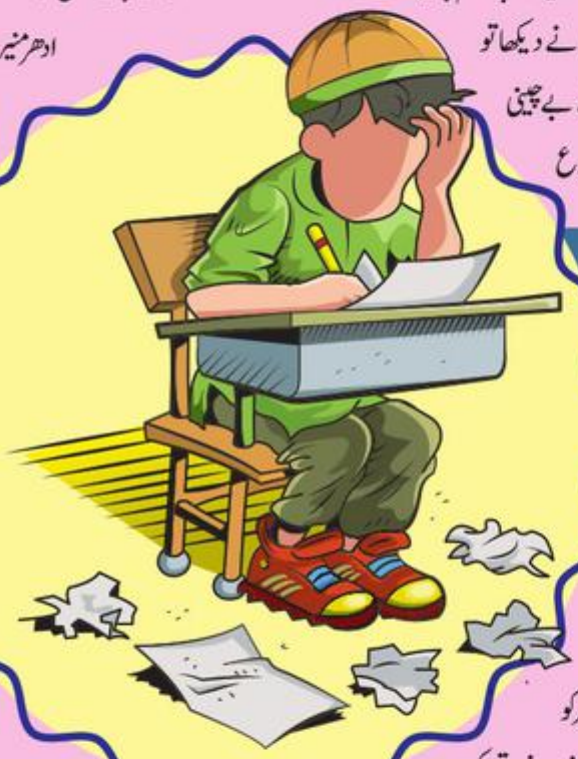

دوسری طرف صلاح الدین خون پسینا بہا کر بھی بمشکل اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا تھا، لیکن اس کی زندگی میں سکون اور اِطمینان تھا، جب کہ منیر کو پریشانیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ گھر، گاڑی، دکان، سب کچھ ہونے کے باوجود اُس کی زندگی میں سکون نہیں تھا۔ ایک پریشانی ختم ہوتی کہ دوسری اسے گھیر لیتی۔ اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا تھا، لیکن اسے واپسی کا کوئی راستہ نہ ملتا تھا۔ ایک طرف تو اُس کے مال و دولت نے اس کا راستہ روکا ہوا تھا اور دوسری طرف اس میں صلاح الدین کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔

اچانک اس کا اکلوتا بیٹا بہت بیمار رہنے لگا۔ منیر اُس کے علاج معالجے کے لیے پیسا پانی کی طرح بہا رہا تھا، لیکن دن بدن اس کے بیٹے کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی اور پھر کچھ دن بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے بیٹے کو خون کا کینسر ہوگیا ہے اور وہ اب صرف چند دِن کا مہمان ہے۔

منیر نے اپنے بیٹے کی صحت کے لیے کافی تگ و دو کی، لیکن اس کی

ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں۔

آخر کار اُس کا بیٹا اسے روتا دھوتا چھوڑ کر اُس سے جدا ہوگیا۔ اس غم نے منیر کو بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ اسے اپنی غلطی اور خیانت کا احساس شدت سے ہونے لگا۔

آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب کچھ جو باقی رہ گیا ہے، اسے بیچ کر صلاح الدین کو اُس کی امانت واپس کرے گا اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ وہ صلاح الدین کے پاس گیا، اسے برتن کی قیمت دی، اس سے معافی مانگی اور کہنے لگا:

''مجھے میری لالچ اور دھوکے کی بہت بڑی سزا ملی ہے۔ اب تم مجھے معاف کر دو، تاکہ اللہ تعالیٰ بھی مجھے معاف کر دیں اور میں باقی زندگی سکون سے گزار سکوں۔

صلاح الدین نے اسے گلے لگایا اور معاف کر دیا۔

حسد کا انجام

حافظ ریان نعمان۔ کراچی

گزرے وقت کی بات ہے، کسی جنگل میں تین بھائی رہتے تھے۔ وہ کھانا پکانے کا کام کرنا چاہتے تھے اور وہ تینوں اپنے کام میں ماہر بھی تھے، لیکن انھیں کہیں کام نہیں ملتا تھا، جس کی وجہ سے وہ مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ صبر و شکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہتے کہ وہ ان کے حالات کو بدل دے۔

ایک دفعہ ان کے گھر ایک فقیر آیا، اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ فقیر بولا:

''میں بہت بھوکا ہوں، خدا کے لیے میری کچھ مدد کرو۔''

ان کے پاس بمشکل ایک وقت کا کھانا تھا۔ انھوں نے وہ کھانا اسے کھلا دیا اور خود بھوکے رہے۔ وہ فقیر دعائیں دیتا رخصت ہوگیا۔ اس طرح جب بھی فقیر اُن کے گھر آتا تو وہ اسے کھانا کھلاتے۔ وہ فقیر انھیں دعائیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اعلیٰ منصب عطا کرے۔

ایک دن ان کے ملک کے بادشاہ نے اعلان کیا کہ محل میں ایک باورچی کی ضرورت ہے۔ جو سب سے اچھا کھانا بنائے گا اسے باورچی رکھا جائے گا۔ یہ تینوں بھائی بھی اپنی قسمت آزمانے چل پڑے۔ بادشاہ نے ان تمام لوگوں کے ہاتھوں کا کھانا کھایا جو شاہی باورچی بننے کے خواہش مند تھے۔ بادشاہ کو اُن بھائیوں کے ہاتھوں کا کھانا سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس نے انھیں دربار میں طلب کیا۔

تینوں بھائی دربار میں پہنچے تو بادشاہ انھیں دیکھ کر بہت زور سے چونکا اور حیرت سے انھیں تکنے لگا اور اُن کا شان دار اِستقبال کیا۔ تینوں بھائی، بادشاہ کی اس حیرت کی وجہ نہ سمجھ سکے۔ اس طرح یہ غریب بھائی شاہی باورچی بن گئے۔ ان کا کھانا بادشاہ کو اِس قدر پسند تھا کہ وہ ان کے ہاتھ کے کھانوں کے علاوہ کوئی اور کھانا نہیں کھاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بادشاہ کے مقربین میں سے ہوگئے۔ بادشاہ ان کی کوئی بات رَد نہیں کرتا تھا۔ یہ بات بھائی بھی نہیں جانتے تھے کہ بادشاہ ان پر اِتنا مہربان کیوں ہے، لیکن انھوں نے بادشاہ سے پوچھا نہیں۔

جب بادشاہ کے وزرا نے یہ دیکھا کہ تینوں بھائی، بادشاہ کے مقرب بنتے جا رہے ہیں تو اُن کے دل میں حسد پیدا ہونے لگا۔ کئی مرتبہ انھوں نے چالیں چلنے کی بھی کوشش کی، لیکن ان کی ہر کوشش بے کار ہوئی۔ بالآخر تمام وزرا سر جوڑ کر بیٹھے اور خوب سوچ و بچار کے بعد اُنھوں نے ان بھائیوں کے خلاف ایک منصوبہ بنایا۔ انھوں نے ایک دن چپکے سے بادشاہ کے کھانے میں پیٹ خراب کرنے کی دوا ملا دی۔ بادشاہ نے جیسے ہی وہ کھانا کھایا اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ تینوں بھائی پریشان ہوگئے کہ یہ کیا ہوگیا؟

اسی دوران میں ایک حاسد وزیر نے بادشاہ کے کان بھرے کہ یہ ساری سازش ان باورچی بھائیوں کی ہے۔ وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں اور آپ کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بادشاہ یہ سنتے ہی غصے سے لال پیلا ہوگیا۔

اس نے فوراً انھیں طلب کیا اور پوچھا:

''کیا یہ حرکت تم نے کی ہے؟'' وہ بھائی بے چارے پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے، بادشاہ کی بات سنتے ہی بے اختیار کانپنے لگے۔ بادشاہ نے انھیں اگلے دن دربار میں پیش کرنے کا کہا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ وزیروں کی سازش ہے۔

بادشاہ کا غصہ جیسے ہی ٹھنڈا ہوا تو اُس نے سوچا کہ یہ شریف بھائی تو ایسا نہیں کر سکتے، ضرور اُن کے خلاف یہ سارا کھیل کھیلا گیا ہے۔ اچانک اسے ایک خیال آیا، اس نے ایک دربان کو بلایا اور اُسے دوائیوں کی دکان پر بھیجا۔ اس دربان نے دکان دار سے پوچھا کہ دو تین دن پہلے کافی مقدار میں پیٹ خراب کرنے کی دوا کس نے خریدی ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں وزیر نے یہ دوا خریدی تھی۔ دربان نے واپس آ کر بادشاہ کو ساری بات بتا دی۔ اب بادشاہ کو حقیقت کا علم ہوا کہ یہ سب ان وزیروں کا کھیل ہے۔

اگلے دن تینوں بھائی ڈرے ڈرے بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے۔ بادشاہ نے جلاد سے کہا کہ فلاں فلاں وزیر کی گردن اڑا دی جائے۔ وزرا، جو خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کہ ہمارے منصوبے کی کسی کو ہوا تک نہیں لگی، خوف سے کانپنے لگے اور بادشاہ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگے۔

پھر بادشاہ نے پوری سازش کو بے نقاب کیا تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وزرا ایسے بھی ہو سکتے ہیں، پھر اُن سازشی وزرا کو قتل کر دیا گیا اور بھائیوں کو اُن وزرا کی جگہ رکھ لیا گیا۔

دربار سے خوشی خوشی لوٹ کر یہ بھائی جیسے ہی گھر پہنچے تھوڑی ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو وہی فقیر کھڑا تھا اور اُس کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ اس نے اندر آتے ہی کہا:

''کیوں بھئی، بادشاہ نے ان وزیروں کو قتل کر کے تمھیں ان کی جگہ رکھ لیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

بھائی بہت حیران ہوئے کہ اس فقیر کو کیسے پتا چلا کہ یہ تبدیلی آچکی ہے، کیوں کہ یہ بات تو محل سے باہر گئی ہی نہیں تھی۔ بھائیوں نے جب اس فقیر سے اس بارے میں پوچھا تو اُس نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ بھائیوں نے جیسے ہی اسے دیکھا وہ اچھل پڑے اور بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا:

''بادشاہ سلامت، آپ!؟''

اب بھائیوں کو بادشاہ کی اس حیرت کا راز معلوم ہوا تھا جو اُسے انھیں دربار میں دیکھ کر ہوئی تھی۔

بادشاہ نے ان سے کہا: ''یہ تمھارے اس اچھے سلوک کا بدلہ ہے جو تم نے میرے ساتھ اس وقت کیا تھا جب میں تمھارے پاس رعایا کی حالت جاننے کے لیے فقیر کے روپ میں آیا کرتا تھا۔

جنت ملک۔ ہری پور

سکھ کے دن

ضامن منہ لٹکائے بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نازش جیسے ہی ضامن کے کمرے کے پاس سے گزری اس کی نظر ضامن پر پڑی۔

نازش کو بہت تشویش ہوئی، کیوں کہ آج ضامن ''امی، امی!'' کا شور مچائے بغیر آیا اور خاموشی سے بیٹھا رہا۔

ضامن اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ باپ ایک کیمیکل کی فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ انھی کیمیکلز نے ضامن کے والد کو ایک موذی بیماری لگا دی، جو کچھ عرصے بعد اُن کی موت کی وجہ بنی۔

ضامن اس وقت ۱۲ سال کا بچہ تھا۔ اس نے اس صدمے کا بہت گہرا اثر لیا اور چپ سادھ لی۔ اسکول چھوڑ دیا، کیوں کہ اب اسے اتنی سی عمر میں گھر کی ذمے داری سنبھالنی تھی۔

نازش سلائی کڑھائی کر کے بمشکل گھر کا کرایہ اور بل ادا کرتی اور ضامن مستریوں اور مزدوروں کے ساتھ دیہاڑی لگا کر دو وقت کی دال روٹی کا خرچہ پورا کرتا۔

اس دن ضامن کے ٹھیکے دار نے ضامن کو بلاوجہ جھڑک کر کے کام سے بھیج دیا اور معاوضہ بھی نہیں دیا۔ ضامن اس بدسلوکی پر بہت افسردہ تھا۔

وہاں سے واپسی پر اسکول کی چھٹی کا وقت تھا۔ ضامن کی نظر اُن بچوں پر پڑی جو اپنے باپ، دادا اور اماں کے ساتھ ہنستے مسکراتے گھر جا رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ضامن ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ ضامن بھی پڑھنا لکھنا چاہتا تھا، پر اُس کے حالات یہ اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ رات جیسے تیسے گزری۔ ضامن نے اپنی ماں کو کچھ نہ بتانے کی ٹھانی اور اپنی خاموشی کا بہانہ سر درد بنا لیا۔

ضامن دوسرے دن کام کی تلاش میں چل پڑا۔ اس نے تہیا کر لیا تھا کہ واپس اس ظالم ٹھیکے دار کے پاس نہیں جائے گا۔ یہاں وہاں ٹھوکریں کھاتا وہ گھومتا رہا۔ گھومتے گھومتے جب تھک گیا تو ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے علاقے کا جاگیردار گزر رہا تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت اعلیٰ ظرف اور نیک دل شخص ہے۔ اس نے رُک کر بچے سے اداسی کی وجہ دریافت کی۔ جاگیردار کے پوچھنے کی دیر تھی کہ ضامن کا جیسے ضبط کا دامن چھوٹ ہو گیا ہو، وہ رو ہانسا ہو گیا اور اپنی ساری روداد جاگیردار کو سنا دی۔

جاگیردار کو بہت دکھ ہوا کہ کیسے وقت نے اس ننھے پھول کو مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ جاگیردار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ضامن اور اُس کی ماں خوددار ہیں، وہ اس کی مدد قبول نہیں کریں گے، اس لیے جاگیردار نے بچے سے کہا: آج سے تم مزدوری نہیں کرو گے، بل کہ اسکول جاؤ گے اور تمھیں اسکول سے وظیفہ ملے گا۔

جاگیردار نے بچے کو اسکول کے بعد گھر کا سودا سلف لانے کی نوکری کی پیش کش کی اور اُس کے بدلے اچھا خاصا معاوضہ رکھا جو ضامن نے بخوشی قبول کر لی اور خوشی خوشی گھر روانہ ہوا۔

آج گھر پہنچتے ہی ''امی، امی!'' کا شور نازش کے کانوں میں گونجا۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر آئی اور ضامن سے اس کی خوشی کی وجہ پوچھی۔

ضامن نے اپنے اسکول میں داخلے اور نوکری کی خوش خبری امی کو سنائی۔

یہ سب سنتے ہی نازش کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اب ان کے سکھ کے دن شروع ہونے والے تھے۔

اللہ لوک

قانتہ رابعہ۔ گوجرہ

نام غلام محمد تھا، عمر بیس بائیس سال تھی، مگر عادتیں اور طور اطوار سب دس سال کے بچوں والے تھے۔ کوئی مست ملنگ کہتا تو کوئی بھولے شاہ۔ ایک نام جو محلے والوں نے دیا، وہ سدا ساتھ چلا: اللہ لوک۔

اللہ لوک واقعی اللہ لوک تھا، بھلا مانس! شہر کے قرب ایک ڈیرے پر ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ابا معذوری کے پانچ سات سال کاٹ کر دنیا کی زندگی سے رہائی پا چکا تھا۔ ماں شہر میں کام کاج اور روزی روٹی کمانے کے لیے آتی تو اُسے بھی لے آتی۔ ماں کسی گھر میں صفائی ستھرائی کرتی، جھاڑو پونچھا لگاتی اور کسی میں برتن بھانڈے دھوتی۔ وہ ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہر گھر میں جاتا اور گھر کے دروازے پر ہی بیٹھا رہتا۔ کوئی ترس کھا کر کھانے کی چیز دے دیتا تو لے کر رکھ لیتا۔ چوکی دار حیرت سے پوچھتا:

”ارے بھولے بادشاہ! صبح سے بھوکے بیٹھے ہو، کھاتے کیوں نہیں؟“

وہ جواب دیتا: ”کیسے کھاؤں!؟ اماں کے ساتھ کھاؤں گا۔“

چوکی دار مذاق کرتے ہوئے کہتا:

”اماں کوئی اچار ہے، جس سے روٹی لگا کر کھاؤ گے۔“

”نہیں، بس اماں کے بغیر لقمہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔“

چوکی دار چپ کی بکل مار لیتا۔ ایک اس کے بچے تھے، مجال ہے کبھی ابا کا انتظار کیا ہو یا کھانے کی چیز بچا کر رکھی ہو۔ اس وقت تو اُسے وہ بھولا ہی قابل رشک لگتا جو ماں کے وجود کو نعمت سمجھتا تھا اور بھوک جیسی ظالم شے کو برداشت کر لیتا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے بھولے عرف اللہ لوک سے چھوٹا موٹا کام کروانا شروع کر دیا۔

”جاؤ، ذرا بھاگ کر کولڈ ڈرنک لے آؤ۔“

”اف، افوہ! سبزی منڈی کون جائے، دس روپے کا دھنیا بازار سے لے آؤ۔“

یوں اللہ لوک سب کی ضرورت بنتا چلا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی خوبیاں سب کے سامنے آنا شروع ہو گئیں۔

اللہ لوک سچ بولتا اور ایمان دار تھا۔ دو روپے کا سکہ بھی سودا سلف کی خریداری سے بچتا تو مالک کو پکڑا تا۔ گو سُست تھا، فہم کی بھی کمی تھی، بات کچھ بتائی جاتی، کر کچھ اور ہی بیٹھتا۔ بینگن منگواتے تو پالک لے آتا، بوتل منگواتے تو شربت ہاتھ میں ہوتا۔ خیر اُس کے فائدے بہر حال نقصان سے زیادہ تھے۔ اللہ ہدایت دے، اپنے بچوں کا تو یہ حال تھا کہ سو روپے کا سودا لاتے اور سو روپے اماں سے بہانے سے اینٹھ لیتے۔

اور ہاں، اللہ لوک بزدل بھی تھا۔ بہت ڈرپوک! کوئی اچانک اس کا نام اونچی آواز میں بھی لیتا تو رونا شروع کر دیتا۔

کالونی کی مسجد میں نماز کے لیے جانا شروع ہوا تو قاری صاحب نے

اسے سینے سے لگایا، بغدادی قاعدہ لے کر دیا۔ پہلے دن وضو کا طریقہ بتایا، دوسرے دن نماز سکھانا شروع کی۔ بس وہ دن اور آج کا دن، مینہ ہو یا آندھی طوفان، اللہ لوک نمازوں کا پورا دھیان رکھتا۔ بہت عمدہ طریقے سے نماز اَدا کرتا۔ امام مسجد اور قاری صاحب نے تو اُسے اپنا بیٹا بنالیا۔ یوں اللہ لوک اب ان سب میں محبوب تھا۔

فارغ بیٹھنا اسے آتا نہیں تھا۔ جہاں جاتا کام میں مدد کرتا۔ لوگ باگ خدا ترسی میں اسے بن مانگے معاوضہ بھی ادا کرتے، مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ لوگ تو اچھے بُرے ہر طرح کے ہی ہوتے ہیں! اگر محلے کے بڑے اسے اچھا سمجھتے تھے، اس کی فرماں برداری کا تذکرہ کرتے تھے تو اُن کے کچھ بچوں کو اللہ لوک ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ بچے اسے زچ کرتے، شرارت کا نشانہ بناتے۔ جب اللہ لوک روتا تو ہنستے ہوئے بھاگ جاتے۔ اسے ڈراتے تو وہ بہت ڈر جاتا۔

ابھی پچھلے دنوں عبدالسلام صاحب کے بڑے بیٹے نے نے اپنے بچوں کو امریکا سے کافی مہنگے تحائف بھیجے، جن میں چاکلیٹ، ٹافیاں، طرح طرح کے کھلونوں کے ساتھ ایک بہت نرم پلاسٹک کی ایک چھپکلی بھی تھی، جو کہ بالکل ہی غیر مناسب چیز تھی، پر بچوں کو بغیر بڑوں کے بتائے کیسے معلوم!

بچوں نے چھپکلی دیکھ کر ایک منصوبہ بنایا۔ مغرب کی نماز کے بعد ملگجے سے اندھیرے میں جب اللہ لوک نے مسجد میں نوافل کی ادائیگی کے بعد سجدے سے سر اُٹھایا اور اُس جگہ پر چھپکلی دیکھی تو اُس نے چیخیں مار مار کر سب کی دوڑیں لگوادیں۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایک بچے کے ہنسنے پر قاری صاحب کو شبہ ہوا، جب اس کی جگہ پر دیکھا کہ دم سادھے چھپکلی پڑی ہے اور اُسے مارنے لگے تو اِنکشاف ہوا کہ یہ تو کسی نے اللہ لوک کے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے، وہ بھی اللہ کے گھر میں!

نمازیوں نے چند منٹوں میں اصل حقیقت کا پتا چلالیا۔ نمازیوں نے ان بچوں پر غیظ و غضب کا اظہار کیا اور اُنھیں پکڑ کر سزا دی تو بجائے اصلاح کے سب بچے اللہ لوک کے مزید خلاف ہو گئے۔

اب جب بھی وہ آپس میں مل بیٹھتے ایک ہی موضوع ہوتا کہ اب کون سی ایسی شرارت اللہ لوک کے ساتھ کی جائے جو اُسے پریشان بھی کرے، مگر کسی کو پتا بھی نہ چلے۔

بالآخر گروپ کے سب سے شرارتی بچے عبدالودود کو انوکھی شرارت سوجھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو پلان بتا کر اپنے آپ کو تھپکی دی۔

''واہ! عبدالودود اسے کہتے ہیں: ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے۔''

''کیا مزے کا منظر ہوگا یار! جب یہ اللہ لوک کا بچہ اسے لیلۃ القدر کی نشانی سمجھ کر سجدے میں گر جائے گا اور پھر ہم اپنی امریکا سے آئی اسپیشل ٹارچ بند کر دیں گے تو وہ گھبرا جائے گا! ہاہاہا!'' ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر سب منہ پھاڑ کر قہقہہ لگانے لگے۔

منصوبہ یہ تھا کہ پچھلے چار پانچ سال کی طرح اس سال بھی مسجد میں اللہ لوک اعتکاف بیٹھے گا تو ستائیسویں شب میں دو، سوا دو بجے اعتکاف والے خیمے کے کپڑے کو پیچھے ہٹا کر اُس کے خیمے کو روشنی سے منور کر دیا جائے گا۔ اللہ لوک اپنے بھولے پن میں روشنی دیکھتے ہی سجدے میں گر جائے گا۔ جب سر اٹھائے گا تو پوری شرارتی پلاٹون اونچی آواز میں ہنستے ہوئے ٹارچ آف کر دے گی، پھر اُس کے چہرے کے تاثرات کو سوشل میڈیا پر ڈال دیا جائے گا۔

''آخری والا حصہ قابل قبول نہیں۔ ابا نے بہت مارا تھا مجھے پچھلی مرتبہ۔ بس ہلکی پھلکی سی شرارت کافی ہے۔'' شاہد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

خدا خدا کر کے رمضان شروع ہوا اور آخری عشرہ بھی شروع ہو گیا۔ ٹارچ تھا تو چھوٹا سا، لیکن بہت زیادہ تیز روشنی والا تھا۔

سب منصوبے کے مطابق اعتکاف والے خیمے کے قریب تھے۔ بظاہر اس سرگرمی میں کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں تھا، بے ضرری شرارت تھی، پھر بھی سب کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ستائیسویں شب، رات ڈیڑھ بجے سب خیمے کے باہر صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے کہ کہیں اللہ لوک سویا ہوا تو نہیں۔

عبدالودود خیمے کا کپڑا تھوڑا سا سرکایا۔ باہر چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ باقی تینوں، مسلم، کمال اور جونی بھی خیمے میں سر گھسانے والے تھے۔ عبدالودود آگے تھا۔

''اوہ میرے خدایا!''

وہ گنگ ہو گیا۔ اللہ لوک دونوں ہاتھ کاندھوں تک اُٹھائے بلک بلک کر اللھم انك عفو تحب العفو فاعف عنی کی تکرار کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا کہ ایک عجیب سی روشنی نے اسے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

خیمے سے باہر عبدالودود، اللہ لوک کو روشنی کے حصار میں دیکھ کر بت بنا ہوا تھا۔

اور یہ ہے اپنا بہاول پور

الطاف حسین۔کراچی

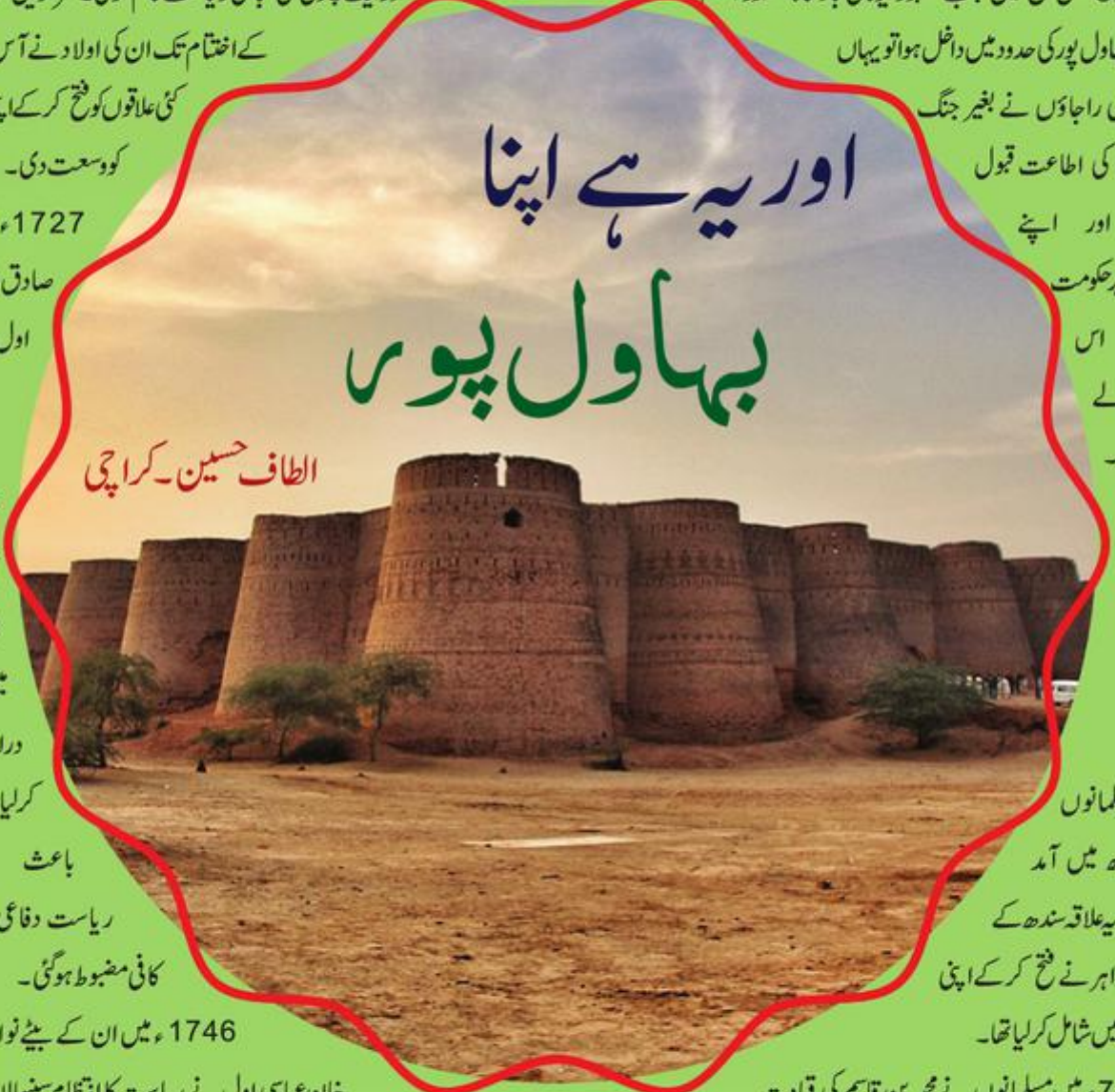

کراچی سے 899 کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے ستلج کے کنارے بہاول پور کا قدیم اور تاریخی شہر آباد ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے 190 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔

سرزمین بہاول پور کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مؤرخین کی رائے کے مطابق یہ علاقہ بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ کے دور میں بھی آباد تھا۔

326 قبل مسیح میں جب مشہور یونانی بادشاہ سکندر اعظم موجودہ بہاول پور کی حدود میں داخل ہوا تو یہاں کے مقامی راجاؤں نے بغیر جنگ کیے اس کی اطاعت قبول کرلی اور اپنے زیر حکومت علاقے اس کے حوالے کردیے۔

مسلمانوں کی سندھ میں آمد سے پہلے یہ علاقہ سندھ کے مہاراجا داہر نے فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا۔

713ء میں مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی قیادت میں ''اُچ شریف'' (بہاول پور) اور ملتان کو فتح کرکے اسلامی سلطنت کا حصہ بنایا۔

1022ء میں سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کیا تو یہ علاقہ سلطنت غزنی (افغانستان) میں شامل ہوگیا۔

1175ء میں سلطنت غور (افغانستان) کے حکمران سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ''اُچ شریف'' (بہاول پور) پر لشکر کشی اور یہاں آباد قرامطیوں کو شکست دے کر اسے سلطنت غور کا حصہ بنا دیا۔

1370ء میں ایک عباسی امیر سلطان احمد دوم اپنے قافلے کے ہم راہ مکران (بلوچستان) کے راستے سندھ میں داخل ہوئے اور سندھ کے ایک سرحدی گاؤں ''بنکا'' کے حکمران ''رائے دہورنگ'' کو شکست دے کر مذکورہ گاؤں پر قبضہ کرلیا اور ایک چھوٹی سی عباسی ریاست قائم کرلی۔ سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک ان کی اولاد نے آس پاس کے کئی علاقوں کو فتح کرکے اپنی ریاست کو وسعت دی۔

1727ء میں نواب صادق خان عباسی اول نے باقاعدہ عباسی حکومت کا آغاز کیا اور 1733ء میں ''قلعہ دراوڑ'' کو فتح کرلیا، جس کے باعث عباسی ریاست دفاعی لحاظ سے کافی مضبوط ہوگئی۔

1746ء میں ان کے بیٹے نواب بہاول خان عباسی اول نے ریاست کا انتظام سنبھالا اور موجودہ بہاول پور کی جگہ ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جو اُن کے نام سے منسوب ہوکر ''بہاول پور'' کہلایا۔ اس شہر کا ایک اور نام ''بغداد الجدید'' بھی تھا۔ نواب بہاول خان عباسی اول نے اپنی ریاست کا سرکاری نام ''مملکت خداداد بہاول پور'' رکھا، جس کا مطلب ہے: ''خدا کی عطا کردہ مملکت بہاول پور''۔

ریاست بہاول پور پر یکے بعد دیگرے کُل بارہ عباسی حکمرانوں نے

تقریباً ڈھائی سو سال تک حکومت کی۔

1933ء میں ریاست میں باقاعدہ ڈاک کا نظام قائم کیا گیا اور ڈاک ٹکٹ بھی طبع کیے گئے۔ ڈاک کا یہ نظام 1949ء تک قائم رہا۔ اسی طرح ریاست بہاول پور کا ''پیپلز بینک'' کے نام سے اپنا علاحدہ بنکاری نظام تھا۔ اس کے علاوہ ریاست بہاول پور کی فوج کی خدمات کے اعتراف کے لیے خصوصی طور پر تمغے بھی تیار کیے گئے تھے۔

1833ء میں ریاست بہاول پور کے پانچویں حکمران نواب بہاول خان سوم نے حکومت برطانیہ سے ایک دوستانہ معاہدہ کیا، جس کے تحت ریاست بہاول پور حکومت برطانیہ کے زیر انتظام آ گئی۔

1907ء میں ریاست بہاول پور کے بارھویں اور آخری حکمراں نواب سر صادق خان پنجم تخت نشین ہوئے۔ ان کے دورِ حکومت کے دوران میں 14، اگست 1947ء کو ایک عظیم ملک ''پاکستان'' کے نام سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا اور 13، اکتوبر 1947ء کو اُن کی خواہش پر گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ایک معاہدے کے تحت ریاست بہاول پور کو پاکستان میں شامل کر لیا اور اُس کی ریاستی حیثیت کو برقرار رکھا گیا۔

14، اکتوبر 1954ء کو جب ون یونٹ (صوبہ مغربی پاکستان) کا قیام عمل میں آیا تو ریاست بہاول پور کا ریاستی درجہ ختم کر دیا گیا اور اُسے ایک شہر کی حیثیت سے مغربی پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔ یکم، اگست 1970ء کو ''ون یونٹ'' کے خاتمے کے بعد مغربی پاکستان کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بہاول پور ایک ڈویژن کی حیثیت سے مغربی پاکستان کے صوبہ پنجاب کا حصہ بن گیا۔

یوں تو ہر عباسی حکمران کے دور میں بہاول پور نے ترقی کی، لیکن آخری عباسی حکمران نواب سر صادق خان پنجم کے دور میں اسے جو ترقی نصیب ہوئی وہ کسی اور عباسی حکمراں کے حصے میں نہ آ سکی۔ ان کے دور حکومت کے دوران میں بہاول پور میں متعدد شِفا خانے، یتیم خانے اور بیوہ خواتین کے فلاح و بہبود کے مراکز، پولیس ٹریننگ اسکول، کئی اسکول اور کالج قائم کیے گئے۔

1925ء میں ''جامعہ عباسیہ'' کے نام سے ایک اسلامی یونی ورسٹی قائم کی گئی جو آج ''اسلامیہ یونی ورسٹی'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

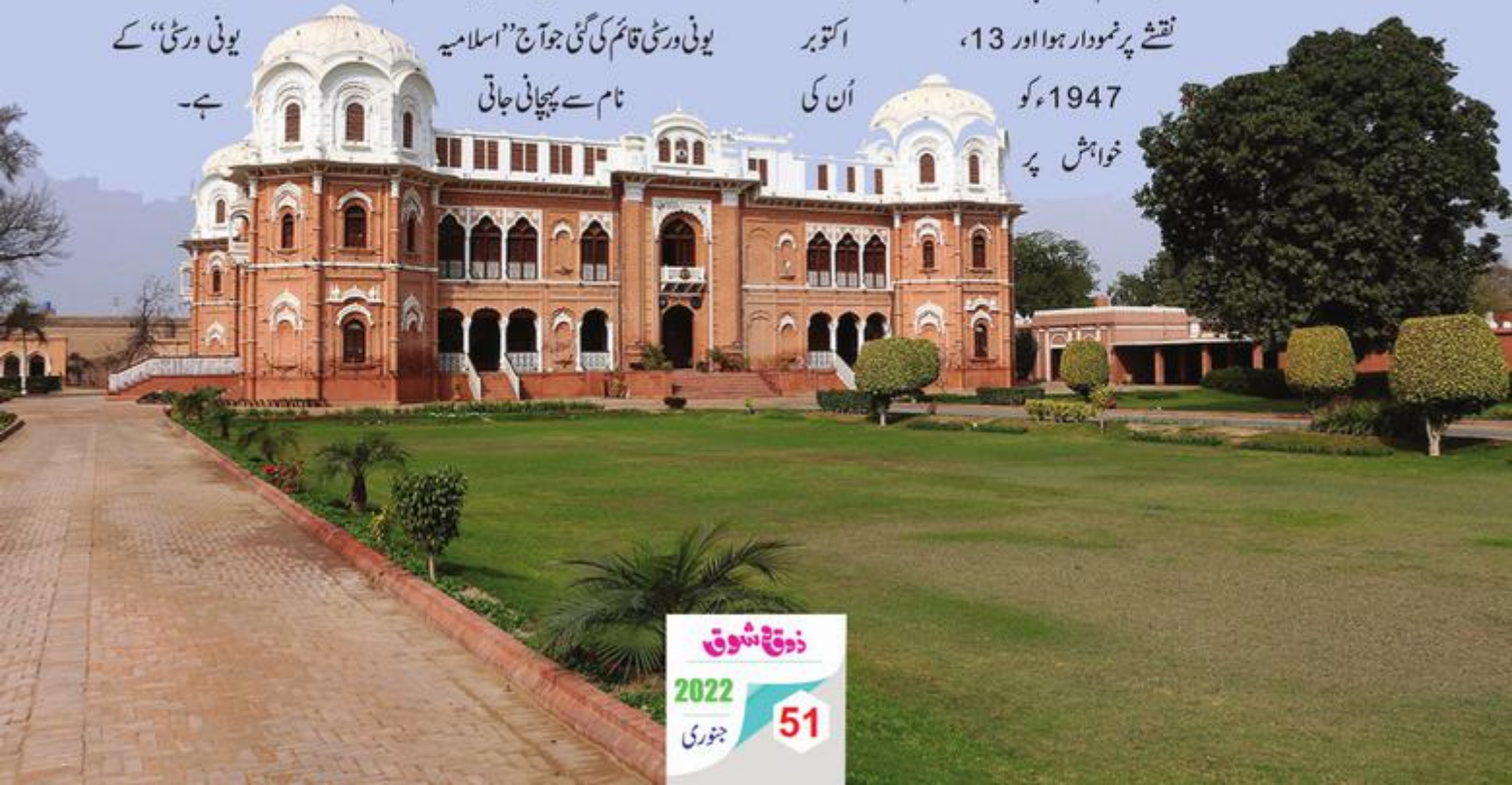

سینٹرل لائبریری بہاول پور، جامع مسجد، ملک شاہ ولی کا مقبرہ، دربار ہال، دولت خانہ محل اور صادق گڑھ پیلس ان کے دور کی عظیم الشان، قابل فخر اور باعث رشک یادگاریں ہیں۔ بہاول پور کی دیگر یادگاروں میں نشاط محل، فرخ محل، گلزار محل اور مبارک منزل شامل ہیں۔

آج کا بہاول پور تعلیم، ثقافت، صنعت وحرفت، زراعت کے شعبوں میں تیزی سے ترقی کی منزل کی جانب گام زن ہے۔ شہریوں کو تعلیمی سہولیات مہیا کرنے کی غرض سے متعدد سرکاری اور پرائیویٹ اسکول، کالج اور فنی تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔

گورنمنٹ صادق ایگرٹن کالج، بہاول پور کا سب سے قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔ 25 اپریل 1886ء کو اسکول کی سطح پر قائم ہونے والے اس ادارے کو 1895ء میں کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ آج یہ کالج نہ صرف ملکی، بل کہ عالمی سطح پر دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کالج 2,61,360 مربع فٹ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کالج میں ہاسٹلز، میڈیکل سینٹر، دو کھیل کے میدان، جمنازیم، ریفریش روم، آڈیٹوریم اور ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ہے، جس میں مطالعے کے شائقین کے لیے تیس ہزار سے زائد کتب، رسائل وجرائد رکھے گئے ہیں۔

بہاول پور میں ''قائداعظم میڈیکل کالج'' کے نام سے ایک طبی تعلیم کا ادارہ بھی قائم ہے۔ اس کے علاوہ خاص بچوں کی تعلیم وتربیت اور فلاح بہبود کے لیے بھی ادارے قائم ہیں، جہاں خاص بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ بریل پرنٹنگ پریس میں خاص بچوں کے لیے بریل رسم الخط میں کتابیں طبع کی جاتی ہیں۔

''بہاول پور میوزیم'' میں عباسی حکمرانوں کا ثقافتی ورثہ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس عجائب گھر میں آپ کو عباسی دورِ حکومت کے سکے، ڈاک ٹکٹ، سرکاری تمغے، اہم دستاویزات، فن پاروں کے نادر نمونے، قرآن مجید کے نایاب قلمی نسخہ جات، کتب، لکڑی اور پتھروں پر کھدائی کے خوب صورت اور دیدہ زیب شاہ کار دکھائی دیں گے۔

بہاول پور کی گھریلو صنعتوں میں خوب صورت نقش ونگار سے مزین برتن اور اُونٹ کی کھال سے تیار کیے جانے والے دل کش لیمپ شامل ہیں، جو دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ یہاں کے جفاکش کاری گروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اعلیٰ معیار کی چادریں، بیڈشیٹ بمعہ تکیہ، کڑھائی دار کرتے، دوپٹے، زری کے کام والے کھسے اور لکڑی کا عمدہ فرنیچر بھی بہت مشہور ہے۔ کھجوروں کے پتوں سے تیار کردہ جاذب نظر چنگیریں، ٹوکریاں، ٹوپیاں اور چٹائیاں بھی تیار کی جاتی ہیں، جب کہ بڑے صنعتی کارخانوں میں چینی، بناسپتی گھی، صابن، چمڑے کی مصنوعات اور سوتی کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔

دریائے ستلج پر بند باندھ کر ''بہاول نہر'' نکالی گئی ہے جو شہر کے کثیر زرعی رقبے کو سیراب کرتی ہے، جس کی وجہ سے بہاول پور کا زرعی پیداوار کا گراف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہاں کی خاص خاص زرعی پیداوار میں گندم، گیہوں، باجرا، جوار، سویابین، کپاس، گنا اور آم شامل ہیں۔

بہاول پور کی قدیم اور تاریخی یادگاروں کے ساتھ ساتھ آپ کو یہاں واقع ''لال سوہنرا پارک'' بھی متاثر کرے گا جو 25 ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں آپ کو سو سے زائد اقسام کے جانور اور سات سو سے زائد اقسام کے رنگ برنگے پرندے دکھائی دیں گے۔ یہ پارک 1972ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اسے پاکستان کا سب سے پہلا نیشنل پارک ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ پارک میں آزاد حیوانی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے دو بلند ''واچ ٹاور'' بنائے گئے ہیں۔ پارک کے قریب ہی سیاحوں کے لیے ''ہٹس'' اور ''ریسٹ ہاؤس'' بھی تعمیر کیے گئے ہیں اور سیاحوں کے لیے ایک بڑا گراؤنڈ (ٹورسٹ کیمپنگ ایریا) بھی بنایا گیا ہے۔

آپ پختہ ٹریک پر سفر کرتے ہوئے ''لال سوہنرا پارک'' تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پارک کے قریب ہی 177,480 ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا سرسبز وشاداب جنگل واقع ہے، جو نہ صرف پکنک منانے کے لیے موزوں ہے، بل کہ نباتات کے طالب علموں کے لیے عمدہ درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

صوبہ پنجاب کا مشہور ومعروف صحرا ''چولستان'' بہاول پور کے قریب واقع ہے۔ اس صحرا کو یہاں کے لوگ مقامی زبان میں ''روہی'' کہتے ہیں۔

26,000 مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلا ہوا یہ صحرا، راجستھان (بھارت) سے نکل کر بہاول پور ڈویژن کے درمیان سے گزرتا ہوا صوبہ سندھ تک چلا گیا ہے۔ صحرائے چولستان میں حضرت چنن پیر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اور چار ہزار سے زائد تاریخی یادگاریں ہیں۔

بہاول پور کا تاریخی دفاعی حصار ''قلعہ دراوڑ'' صحرا چولستان کے وسط میں واقع ہے۔ یہ ناقابل فراموش اور تاریخی قلعہ گزرے زمانے کی

یادوں کی کہانی سناتا دکھائی دیتا ہے۔

ایک بیان کے مطابق اس قلعے کو راول نامی ایک جوگی نے عمل کیمیا گری کے ذریعے سے حاصل ہونے والی دولت سے تعمیر کرایا تھا۔ اسی جوگی کے نام سے منسوب ہو کر یہ قلعہ ''ڈیر راول'' یعنی ''راول کی رہائش گاہ'' کہلایا اور پھر یہی نام مقامی لب و لہجے کی وجہ سے بدل کر ''دراوڑ'' بن گیا۔

جب کہ ایک اور بیان کے مطابق یہ قلعہ راجا داہر نے تعمیر کرایا تھا اور اِس قلعے کا اصل نام ''داہرور'' تھا جو کثرتِ استعمال سے بگڑ کر ''دراوڑ'' ہو گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق یہ عظیم الشان دفاعی حصار ایک ہزار سال قبل ''جسلمیر (راجپوتانہ)'' کے ایک راجا ''بجے راؤ'' کے ولی عہد ''دیوراج'' نے اپنے ماموں ''رئیس بھوڑ'' سے مقابلہ کرنے کی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔

ایک اور بیان کے مطابق یہ قلعہ ریاست بہاول پور کے عباسی حکمران نواب مبارک خان نے اپنے دورِ حکومت (1749ء تا 1772ء) میں تعمیر کرایا تھا۔

یہ قلعہ مٹی کے ایک مصنوعی ٹیلے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ قلعے کا بڑا دروازہ لوہے اور لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ دروازے کے اوپر لوہے کی بڑی بڑی سلاخیں لگی ہوئی ہیں، جن کی تنصیب ہاتھیوں کو قلعے کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے کی گئی تھی۔ قلعے میں داخلے کا ایک اور بڑا دروازہ شمالی سمت میں ہے جب کہ ایک دروازہ فصیل کے اندر بھی ہے۔ یہاں ایک بڑی سرنگ ہے جو محراب دار چھت سے شروع ہو کر مغرب کی سمت میں مُڑتی چلی گئی ہے۔ دائیں طرف فوجیوں کی رہائش گاہیں ہیں اور بیرونی حالات و واقعات کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے ایک مورچہ بھی بنا ہوا ہے۔

مغرب میں سڑک کے دائیں بائیں کمرے بنے ہوئے ہیں۔ دائیں طرف والے کمرے فوجیوں کے لیے اور بائیں طرف کے کمرے اسلحے کے لیے مخصوص تھے۔ جہاں سڑک ختم ہوتی ہے وہاں ایک میدان ہے، جس میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ مسجد کے جنوب میں ایک خستہ حال عمارت ہے، یہاں کبھی ریاست بہاول پور کے انتظامی دفاتر ہوا کرتے تھے۔ اس عمارت کے اندر ایک طویل برآمدہ بھی ہے جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اس برآمدے کی جنوبی سمت ایک چکردار راستہ ہے۔

خستہ حال عمارت کے پیچھے نواب آف بہاول پور کے اہل خانہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ مغربی سمت میں مزید آگے بڑھیں تو آپ کو وہاں عباسی خاندان کے ملازمین کے کمرے نظر آئیں گے۔

''قلعہ دَراوڑ'' کی سیر کے دوران میں آپ کو اُس کی حفاظت کے لیے بنائی جانے والی دو بڑی توپیں بھی دکھائی دیں گی۔ ان کے علاوہ کئی چھوٹی جسامت کی توپیں بھی نظر آئیں گی جنھیں زنگ لگ چکا ہے۔

قلعے کے مشرقی حصے میں مجرموں کو سزا دینے کے لیے ٹکٹکی بھی بنی ہوئی ہے۔ قلعے کے باہر خندق کی طرف اینٹوں کی مدد سے مختلف ڈیزائنوں میں پشتے بنائے گئے ہیں، جن کی بلندی تقریباً 40 فٹ ہے۔ قلعے کی اندرونی فصیل پر 8 فٹ

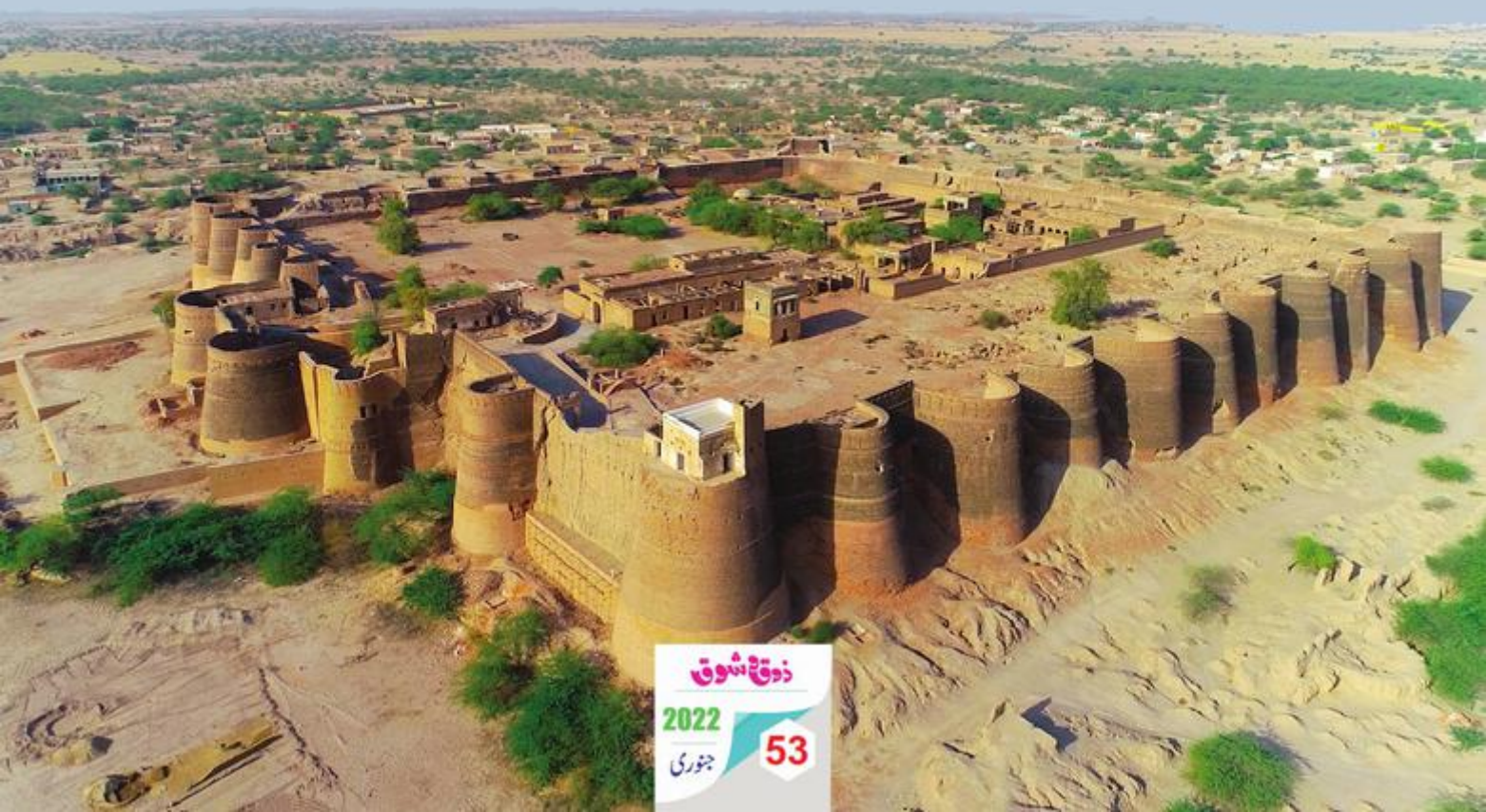

بلند خفیہ محراب دار مورچے بنے ہوئے ہیں، جن میں چھپ کر دشمن پر تیروں یا آتشیں اسلحے سے جوابی حملہ کیا جاتا تھا۔

اس قلعے کی بیرونی فصیل تباہی کا ڈھیر بن چکی ہے، لیکن اس کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ فصیل بھی فنِ تعمیر کا شاہ کار تھی جو بے توجہی کا شکار ہو کر برباد ہو گئی۔ اس تباہ شدہ فصیل کے پاس ایک بازار بھی قائم کیا گیا تھا، جس کی دکانیں اب کھنڈر بن چکی ہیں۔

قلعہ دراوڑ کے متعلق سرائیکی زبان کی ایک ضرب المثل بہت مشہور ہے:

''توں رنگ ایویں وٹے نے جیویں دراوڑ دا کوٹ وٹیندے''

اردو زبان میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم تو اِس طرح رنگ بدلتے ہو جیسے دراوڑ کا قلعہ رنگ بدلتا ہے۔

اس ضرب المثل کا پس منظر یہ ہے کہ چولستان (روہی) کی سرابی کیفیت کے تحت قلعے کی دیواریں دن میں سات آٹھ مرتبہ رنگ بدلتی ہیں۔

''اُچ شریف'' کا قدیم قصبہ شہر سے 53 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس قصبے کا قدیم نام ''دیوگڑھ'' تھا۔ 1224ء میں حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر اُن کے مرید حضرت جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بے شمار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا تھا۔ 1291ء میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے وصال فرمایا اور یہیں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت شیخ جمال رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید صدرالدین راجو قتال رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت غوث گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اُچ شریف'' کو رونق بخشی اور اِس علاقے میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار اَدا کیا۔

عزیز قارئین! بہاول پور اپنی تمام تر تاریخی رعنائیوں کے ساتھ آپ کی آمد کا منتظر ہے۔

تو پھر آپ کب جا رہے ہیں بہاول پور!؟

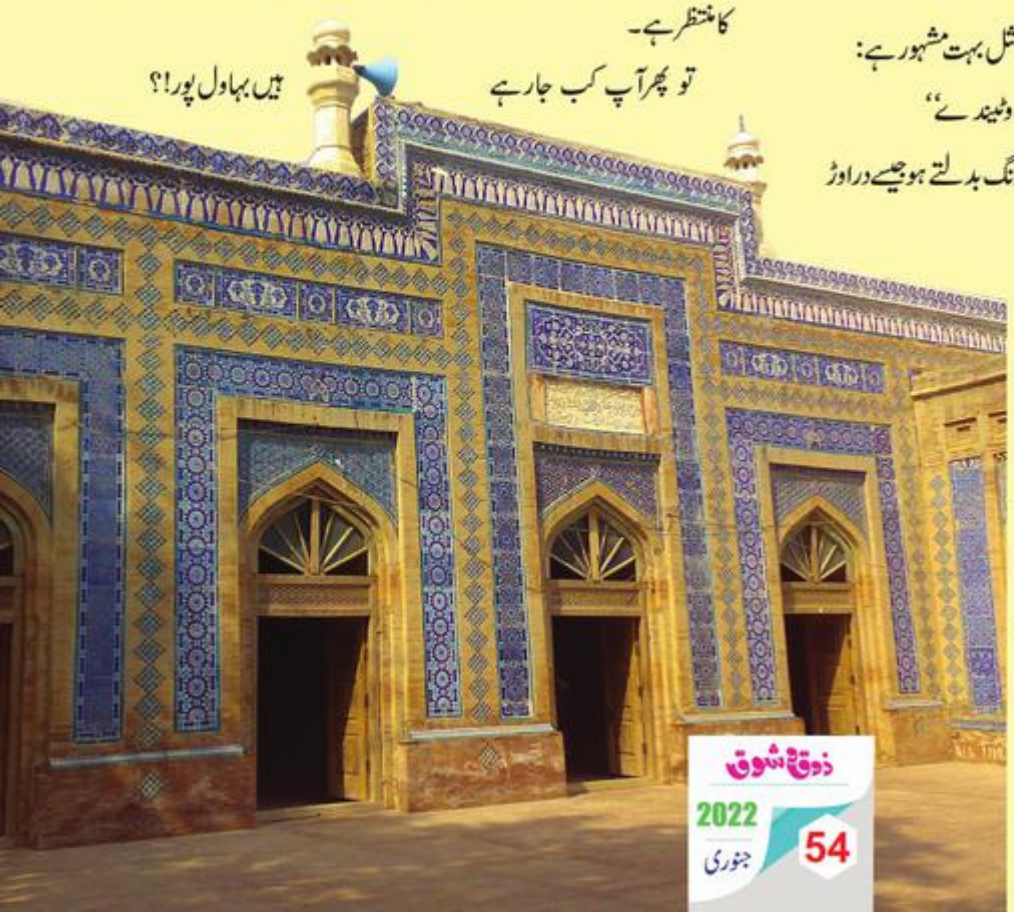

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ ذوق و شوق کراچی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی
کی زیر سرپرستی الحمدللہ گزشتہ ۱۵ برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

اس شمارے میں بچوں/بچیوں کے لیے تعلیم، تربیت اور تفریح سے بھرپور مواد ہوتا ہے، جس کا بچوں/بچیوں کو انتظار رہتا ہے۔ یہ رسالہ بچوں کے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ملک میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔

اگر آپ اپنے بچوں/بچیوں کو فی زمانہ چھوٹی بڑی اسکرین سے بچانے کے لیے کسی متبادل کی تلاش میں ہیں تو ماہ نامہ ذوق وشوق کافی حد تک آپ کی امیدوں پر پورا اُتر سکتا ہے۔

اس کے لیے آپ اپنے نام، مکمل ڈاک کے پتے اور جس ماہ سے رسالہ جاری کروانا ہے اس ماہ کا نام لکھ کر صرف ہزار (1000/=) روپے جمع کروائیں اور ہر ماہ، ماہ نامہ ''ذوق وشوق'' گھر بیٹھے حاصل کریں۔

خط و کتاب کا پتا:
ماہ نامہ ذوق وشوق، کراچی
پی۔او۔بکس نمبر: 17984
گلشن اقبال، کراچی۔
پوسٹ کوڈ: 75300
ذوق شوق/Zouq shouq
zouqshouq@hotmail.com

(شمارے کی قیمت بڑھنے کی صورت میں سالانہ خریداری کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے۔)

سالانہ خریداری کے لیے چار ذرائع سے آپ رقم جمع کروا سکتے ہیں:

1 منی آرڈر کے ذریعے۔
اس کے لیے ہمارا پتا ہے: ماہ نامہ ذوق وشوق، کراچی، پی۔او۔بکس نمبر: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300

2 بینک اکاؤنٹ کے ذریعے۔ بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا میزان بینک اکاؤنٹ یہ ہے:
اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm Trust Zouq o Shouq اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456
(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید آپ ہمیں اس نمبر پر (0324-2028753) واٹس ایپ کردیں۔)

3 دستی۔
دفتر میں آکر رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا پتا ہے: مدرسہ بیت العلم، ST-9E، نزد الحمد مسجد، گلشن اقبال بلاک ۸، کراچی
(نوٹ: دستی رقم جمع کرواتے وقت سالانہ خریداری فارم ضرور پُر کریں۔)

4 جازکیش کے ذریعے۔
اپنی سالانہ خریداری کی رقم اس نمبر پر بھیج دیں: 0320-1292426
(نوٹ: رقم جمع کروانے کے بعد اس نمبر پر مطلع کردیں۔)

کوپن برائے
بلاعنوان ۱۷۳

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ________________________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے
ذوقِ معلومات ۷۲

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ________________________

فون نمبر: ____________

سوال آدھا جواب آدھا ۲۸

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ________________________

فون نمبر: ____________

ہدایات: جوابات ۳۱ جنوری ۲۰۲۲ء تک ہمیں موصول ہوجانے چاہییں...... ☆ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

بیت العلم
BAIT UL ILM

کراچی انٹرنیشنل بک فیئر

30 دسمبر 2021 سے 3 جنوری 2022

درسی، اصلاحی اور کہانیوں

کی کتابوں پر شان دار بچت

بمقام : ایکسپو سینٹر، کراچی

MBI
MAKTABA BAIT-UL-ILM

MaktabaBaitulilm
Website : www.mbi.com.pk
0309-2228089, 021-32726509

کراچی انٹرنیشنل بک فیئر (عالمی کتب میلہ) میں مکتبہ بیت العلم کے اسٹال پر تشریف لائیے.....

درسی، اصلاحی اور کہانیوں کی کتابوں کی خریداری کیجیے .....

اور ان کتب کی خریداری پر.....ایک خوب صورت انعام وصول کیجیے۔

سلسلہ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk